

تفسير

[illegible]

پاره نمبر 1

www.jamiafaridia.org.pk , 040-4466985, 040-4460985

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نور القرآن (جلداول)
 مصنف _____ علامہ پیر ابوالنصر منظور احمد شاہ صاحب
 کمپوزنگ _____ محمد ندیم فریدی جامعہ فریدیہ ساہیوال
 معاون کمپوزنگ _____ محمد رضوان محمود، عطاء المصطفیٰ
 پروف ریڈنگ _____ عبدالقدیر فریدی، احسان الحق فریدی
 طباعت _____ فریدیہ پرنٹنگ پریس لیاقت چوک
 ساہیوال فون 040-4221485
 تاریخ طباعت _____ پہلا ایڈیشن اگست 2005ء
 دوسرا ایڈیشن دسمبر 2006ء
 تعداد _____ ایک ہزار
 ناشر _____ مکتبہ نظامیہ جامعہ فریدیہ ساہیوال

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت	صفحہ
۱	مقدمہ			۳
۲	علم تفسیر			۵
۳	علم تفسیر کے درجات			۸
۴	عہد صحابہ کے مشہور مفسرین			۸
۵	مختلف تفاسیر کا تعارف			۹
۶	تفسیر ابن عباس			۹
۷	تفسیر ابن کثیر			۹
۸	تفسیر طبری			۱۰
۹	تفسیر کبیر			۱۰
۱۰	تفسیر ابن عربی			۱۰
۱۱	تفسیر قرطبی			۱۱
۱۲	تفسیر روح المعانی			۱۱
۱۳	قرآن پاک پر لکھنے والے بعض اکابر			۱۱
۱۴	علم تفسیر کے متعلق مختلف آراء			۱۴
۱۵	لفظ تاویل کے معانی			۱۵
۱۶	نزول وحی کی کیفیتیں			۱۶

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱۷	وحی کے معانی			۱۸
۱۸	نزول قرآن کریم کی تین صورتیں			۱۹
۱۹	نزول قرآن کریم کے مراحل			۲۰
۲۰	تفسیر کے لئے ضروری معلومات			۲۱
۲۱	جمع و ترتیب قرآن حکیم			۲۲
۲۲	محکمات و متشابہات			۲۵
۲۳	متشابہات کی حکمتیں			۲۶
۲۴	ناسخ و منسوخ			۲۷
۲۵	ناسخ و منسوخ پر یہود و نصاریٰ کا اعتراض			۲۹
۲۶	حروف مقطعات			۳۰
۲۷	بعض مشکل مقامات			۳۲
۲۸	لفظ ”وجہ“ کا معنی			۳۳
۲۹	لفظ ”نفس“ کا معنی			۳۴
۳۰	لفظ ”ید“ کا معنی			۳۵
۳۱	لفظ ”ساق“ کا معنی			۳۵
۳۲	وحی الہی کی ضرورت			۳۵
۳۳	پہلی وحی اور غار حرا			۳۷
۳۴	غار حرا کے انتخاب کی حکمتیں			۳۸

نمبر شمار	مضامین	سورة	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۳۵	اللہ کی پناہ	۱		۳۹
۳۶	بسم اللہ کے فضائل	۱		۴۱
۳۷	فضائل الفاتحہ			۴۴
۳۸	لفظ حمد کی تشریح	۱	۱	۴۶
۳۹	ربوبیت	۱	۱	۴۸
۴۰	عالمین	۱	۱	۴۹
۴۱	الرحمن الرحیم	۱	۲	۵۰
۴۲	اللہ کی عبادت اور مدد	۱	۴	۵۵
۴۳	صراط مستقیم	۱	۵	۵۹
۴۴	انعام یافتہ لوگوں کا راستہ	۱	۶	۶۱
۴۵	آمین	۱		۶۴
۴۶	سورہ بقرہ شریف	۲		۶۵
۴۷	آکم کی وضاحت	۲	۱	۶۷
۴۸	تقویٰ کی فضیلت	۲	۲	۶۹
۴۹	متقین کی صفات	۲	۳	۷۲
۵۰	آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان اور آخرت پر یقین	۲	۴	۷۸
۵۱	فلاح و کامران لوگ	۲	۵	۸۰
۵۲	کفار کی ہٹ دھرمی کا انجام	۲	۶	۸۳

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۵۳	منافق کی نشانیاں	۲	۸	۸۵
۵۴	منافقین کی بد عملی	۲	۹	۸۶
۵۵	منافقین کیلئے دردناک عذاب	۲	۱۰	۸۷
۵۶	زمین میں فساد کرنے والے منافقین ہی ہیں	۲	۱۲، ۱۱	۸۹
۵۷	منافقین کی بے وقوفی	۲	۱۳	۹۱
۵۸	منافقین کی ایک اور چال	۲	۱۴	۹۳
۵۹	منافقین کی پکڑ	۲	۱۵	۹۴
۶۰	نقصان کی تجارت	۲	۱۶	۹۶
۶۱	منافقین کے اعمال کی مثال	۲	۱۸، ۱۷	۹۷
۶۲	منافقین کی حالت	۲	۱۹	۹۹
۶۳	اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے	۲	۲۰	۱۰۰
۶۴	ہر انسان کیلئے عبادت کا حکم	۲	۲۱	۱۰۲
۶۵	انعامات الہیہ کا ذکر	۲	۲۲	۱۰۳
۶۶	قرآن حکیم کا چیلنج	۲	۲۳	۱۰۵
۶۷	منکرین کی ناکامی اور ان کیلئے وعید	۲	۲۴	۱۰۶
۶۸	ایمان والوں کیلئے انعامات	۲	۲۵	۱۰۷
۶۹	ایمان اور عمل صالح	۲		۱۰۸
۷۰	اللہ تعالیٰ کا چھوٹی سے چھوٹی مثال پیش فرمانا	۲	۲۶	۱۰۹

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۷۱	وعدہ کی خلاف ورزی	۲	۲۷	۱۱۱
۷۲	انسان کی کیفیات اور موت کی حقیقت	۲	۲۸	۱۱۳
۷۳	زمین و آسمان کی تخلیق	۲	۲۹	۱۱۴
۷۴	انسان کی وجہ عظمت (اللہ تعالیٰ کا خلیفہ)	۲	۳۰	۱۱۶
۷۵	خلیفہ			۱۱۷
۷۶	آدم علیہ السلام کو غلطی کی سزا کے مفہوم کی تردید			۱۱۷
۷۷	آدم علیہ السلام کو وسیع علم کا سکھایا جانا	۲	۳۱	۱۱۹
۷۸	فرشتوں کی عاجزی	۲	۳۲	۱۲۰
۷۹	آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام بتانے کا حکم	۲	۳۳	۱۲۱
۸۰	ابلیس کا سجدہ کرنے سے انکار اور تکبر	۲	۳۴	۱۲۳
۸۱	سجدہ کی اقسام			۱۲۳
۸۲	آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو جنت میں ٹھہرنے کا حکم	۲	۳۵	۱۲۴
۸۳	شیطان کی مکاری	۲	۳۶	۱۲۶
۸۴	آدم علیہ السلام کو توبہ کے کلمات سکھائے گئے	۲	۳۷	۱۲۷
۸۵	اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کا انجام	۲	۳۹	۱۳۰
۸۶	بنی اسرائیل کو عہد پورا کرنے کی تلقین	۲	۴۰	۱۳۱
۸۷	یہود کو ہدایات	۲	۴۱	۱۳۳
۸۸	اللہ تعالیٰ کی آیات کو بیچنے کا مفہوم			۱۳۳

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۸۹	حق باطل میں فرق کی تلقین	۲	۴۲	۱۳۴
۹۰	نماز و زکوٰۃ کا حکم	۲	۴۳	۱۳۴
۹۱	باجاماعت نماز کی اہمیت			۱۳۵
۹۲	جو دوسروں کو کہو خود بھی کرو	۲	۴۴	۱۳۶
۹۳	صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرنے کا حکم	۲	۴۵	۱۳۷
۹۴	صبر کی اقسام			۱۳۸
۹۵	بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات کی یاد دہانی	۲	۴۷	۱۳۹
۹۶	قیامت کے دن کا حال	۲	۴۸	۱۴۰
۹۷	بنی اسرائیل کو آل فرعون سے نجات دلانے کی یاد دہانی	۲	۴۹	۱۴۲
۹۸	بنی اسرائیل کا پھڑکے کو معبود بنانا	۲	۵۳	۱۴۴
۹۹	بنی اسرائیل کی توبہ کی قبولیت کا انداز	۲	۵۴	۱۴۶
۱۰۰	خدا کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار	۲	۵۵	۱۴۷
۱۰۱	بنی اسرائیل پر من و سلوی کا اترنا	۲	۵۷	۱۴۹
۱۰۲	بنی اسرائیل کیلئے بارہ چشموں کا بہہ نکلنا	۲		۱۵۲
۱۰۳	من و سلویٰ کو چھوڑ کر زمینی چیزوں کا مطالبہ	۲	۶۱	۱۵۴
۱۰۴	ایمان والوں کیلئے قیامت کے دن اجر عظیم	۲	۶۲	۱۵۶
۱۰۵	تورات کے نزول کی کیفیت	۲	۶۳	۱۵۸
۱۰۶	بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن کی نافرمانی کی سخت سزا	۲		۱۶۰

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱۰۷	گائے کا واقعہ	۲	۶۸، ۶۷	۱۶۲
۱۰۸	بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی مذمت	۲	۷۴	۱۶۷
۱۰۹	یہود کی ضدی طبیعت کا ذکر	۲	۷۵	۱۶۸
۱۱۰	یہود کی منافقت	۲	۷۷، ۷۶	۱۷۰
۱۱۱	یہود کے ان پڑھ لوگوں کی جھوٹی خواہشات	۲	۷۸	۱۷۱
۱۱۲	یہود کے غلط گمان کی تردید	۲	۸۰	۱۷۲
۱۱۳	بنی اسرائیل سے لئے گئے وعدے کی یاد دہانی	۲	۸۳	۱۷۴
۱۱۴	یہود کی سخت نافرمانیاں	۲	۸۶، ۸۵	۱۷۷
۱۱۵	یہود کا سابقہ عمل اور موجودہ ہٹ دھرمی	۲	۸۹	۱۸۰
۱۱۶	بنی اسرائیل حسد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے	۲	۹۰	۱۸۲
۱۱۷	یہود کا پہلے انبیاء کو قتل کرنا	۲	۹۱	۱۸۳
۱۱۸	یہود کا مچھڑے کو معبود بنانا	۲	۹۲	۱۸۴
۱۱۹	اگر یہود سچے ہیں تو موت کی تمنا کریں	۲	۹۴	۱۸۶
۱۲۰	یہود زندگی پر دوسروں سے زیادہ حریص ہیں	۲	۹۶	۱۸۷
۱۲۱	جو اللہ کے فرشتوں اور رسولوں کا دشمن وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن	۲	۹۸	۱۸۹
۱۲۲	حضرت سلمان علیہ السلام جادو گر نہ تھے	۲	۱۰۲	۱۹۲
۱۲۳	ہاروت ماروت کا قصہ	۲	۱۰۲	۱۹۲
۱۲۴	سحر (جادو) کیا ہے؟	۲		۱۹۴

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱۲۵	تعظیم مصطفیٰ ﷺ میں راعنا کہنے کی ممانعت	۲	۱۰۴	۱۹۶
۱۲۶	ناسخ منسوخ کا حکم	۲	۱۰۶	۱۹۸
۱۲۷	انبیاء سے کثرت سوال کرنے کی ممانعت	۲	۱۰۸	۲۰۰
۱۲۸	ایمان والوں کو نماز و زکوٰۃ کی تلقین	۲	۱۱۰	۲۰۲
۱۲۹	”یہود ہی صرف جنت میں جائیں گے“ اس غلط نظریہ کی تردید	۲	۱۱۱	۲۰۲
۱۳۰	یہود و نصاریٰ کا جھگڑا	۲	۱۱۳	۲۰۳
۱۳۱	مساجد میں ذکر الہی سے روکنے والا سب سے بڑا ظالم	۲	۱۱۴	۲۰۵
۱۳۲	اللہ ہر جگہ موجود ہے	۲	۱۱۵	۲۰۶
۱۳۳	یہود و نصاریٰ کے اللہ تعالیٰ پر الزامات	۲	۱۱۶	۲۰۷
۱۳۴	حضور ﷺ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا	۲	۱۱۹	۲۱۰
۱۳۵	یہود و نصاریٰ آپ پر راضی نہ ہوں گے	۲	۱۲۰	۲۱۱
۱۳۶	مومن ہی قرآن کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں	۲	۱۲۱	۲۱۲
۱۳۷	بنی اسرائیل پر کی گئی نعمتوں کا ذکر	۲	۱۲۲	۲۱۳
۱۳۸	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفاداری پر انعامات	۲	۱۲۴	۲۱۵
۱۳۹	بیت اللہ شریف کی اہمیت	۲	۱۲۵	۲۱۶
۱۴۰	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں	۲	۱۲۶	۲۱۸
۱۴۱	ملت ابراہیم سے روگردانی حماقت ہے	۲	۱۳۰	۲۲۳
۱۴۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی اولاد کو وصیت	۲	۱۳۲	۲۲۵

نمبر شمار	مضامین	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱۴۳	حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنی اولاد کو وصیت	۲	۱۳۳	۲۲۵
۱۴۴	دین ابراہیم ہی سیدھا دین ہے	۲	۱۳۵	۲۲۷
۱۴۵	اللہ کے رنگ سے کیا مراد ہے؟	۲	۱۳۸	۲۳۰
۱۴۶	یہود کے غلط نظریہ کی تردید	۲	۱۴۰	۲۳۲

بسم الله الرحمن الرحيم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ جل مجدہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے دینی معاملات میں دلچسپی کی توفیق بخشی۔ تبلیغ و تدریس کے ساتھ ساتھ کتب نویسی میں بھی کچھ شوق بخشا واللہ الحمد، سیرۃ النبی ﷺ کے مقدس اور اہم عنوان پر ”جلوہ جاناں“ کتاب کے چوتھے حصہ کی تکمیل پر یک لخت ذہن نے پلٹا کھایا کہ اب مجھے تفسیر القرآن کے عنوان پر کچھ لکھنا چاہئے۔ میری یہ سوچ میرے جیسے کم علم کیلئے سمندر میں چھلانگ لگانے کی سوچ ہے جبکہ میں تیراک بھی نہیں، محض اس بھروسے پر کہ میرا اللہ مجھے کنارے لگا دے گا۔ حدیث قدسی ”انا عند ظن عبدی بی“ نے حوصلے کو مزید ہمیز لگائی اور آج ۲۸ رجب المرجب شریف ۱۴۲۵ھ بمطابق ۱۵/ ستمبر ۲۰۰۴ء کو نماز تہجد کے بعد اس کا آغاز کیا اور بارگاہ رسالت میں تکمیل کیلئے درخواست کی ہے۔ امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کا شعر یاد آ رہا ہے۔

آنے دو یا ڈو دو اب تو تمہاری جانب
کشتی تمہیں پہ چھوڑی لنگراٹھادئے ہیں

مجھے اچھی طرح یہ علم ہے کہ میری اس تفسیر سے قارئین کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکے گا کہ اس سے پہلے لاکھوں درجہ زیادہ حسین تفاسیر لکھی جا چکی ہیں اور وہ تفاسیر عوام و خواص سے داد تحسین بھی حاصل کر چکی ہیں تاہم یہ ایک میراجنون ہے، ذوق ہے جو مجھے اس میدان میں لے آیا ہے، سیدنا یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں سوت کی اٹنی لے کر آنے والی خاتون کی طرح قرآن مقدس کی خدمت کرنے والے جلیل القدر علماء، محدثین کی صف میں نام لکھنا چاہتا ہوں۔

میری مثال اُس فقیر و گداگر بھکاری کی ہے جس کے پیالے میں مختلف گھروں سے مانگی گئی بھیک کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ ہے تو یہ فقیر، گداگر مگر اس کی جھولی بتاتی ہے یہ کئی گھروں سے مانگ کر لایا ہے مگر یہ

بات بھی سمجھ آتی ہے کہ یہ فقیر، گداگر امیر لوگوں کا بھکاری ہے کہ اس کی جھولی میں رنگا رنگ قیمتی کھانوں کی جھلک اور مہک ہے۔ یہی میری مثال ہے، میری اس تالیف میں بھی کوئی بات اچھی محسوس کریں تو سمجھیں کہ میں بھی وہ بات علماء، محققین، مفسرین کے گھروں سے مانگ کر لایا ہوں۔ یا میری اس کاوش کو یوں سمجھ لیں کہ میں کوئی نئی چیز نہیں لا رہا، مختلف باغوں کے مختلف پودوں سے مختلف رنگا رنگ کے پھول توڑ لایا ہوں اور کوشش کی ہے کہ اچھی قسم کا گلدستہ بنا کر مارکیٹ میں لے آؤں، کیا بعید یہ گلدستہ، یہ کاوش، یہ محنت میرے لئے نجات کا باعث بن جائے۔ اللہ کرے یہ گلدستہ میں اپنی زندگی میں بنا سکوں اور پیش کر سکوں تاہم خدا خواستہ زندگی نے وفانہ بھی کی تو مجھے مکمل نہ کرنے کا کوئی غم نہیں ہوگا اور یہ عظیم سعادت سمجھ لوں گا کہ گلدستہ بناتے بناتے موت آگئی۔ تفسیر کا پورا کرنا بھی بہت بڑی سعادت ہے خوش قسمتی ہے، مگر لکھتے لکھتے زندگی پوری ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑی سعادت ہے۔

اس تفسیر کو علماء کرام کے مشورے مطابق انتہائی سادہ، عام فہم اور آسان انداز میں لکھنے کا ارادہ کیا ہے، مشکل اور پیچیدہ مسائل کو مختصر انداز میں حل کرنے کی کوشش کروں گا، تاکہ علماء کے علاوہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔

مجھے شوق ہے میری یہ کاوش جامعہ فریدیہ کی لائبریری میں ہو اور ہر عوام و خواص اس سے استفادہ کریں اور میری آخرت کی بہتری، سرخروئی اور نجات کیلئے دعا کریں۔

غرض نقشے ست کز مایا دماند کہ ہستی رانمی بنم بقائے

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ابوالنصر منظور احمد

جامعہ فریدیہ ساہیوال

علم تفسیر

اس مقدس علم کا آغاز حضور سید عالم ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہوا جب کبھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کو قرآن مقدس کی کسی آیہ مبارکہ پر تشریح مطلوب ہوتی تو حضور ﷺ سے دریافت کر لیا کرتے تھے، رب قدوس جل مجدہ نے جہاں حضور ﷺ کو بے پناہ اور بے شمار انعامات سے نوازا ہے وہاں قرآن مقدس کی تفسیر اور تشریح کے جلیل منصب سے بھی سرفراز فرمایا ہے حضور ﷺ کے مقام کو قرآن مقدس نے سورة النحل میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وانزلنا اليك الذكر لتبين للناس - (سورة النحل)

”ہم نے آپ پر قرآن پاک نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں پر واضح کر دیں“

اسی کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علم تفسیر کا بے بہا خزانہ حضور ﷺ کے ارشادات عالیہ ہی ہیں جو آپ نے تفسیر کے طور پر صحابہ کو بتائے یا یوں کہہ لیجئے کہ احادیث مبارکہ ایک تفسیری خزانہ ہے پھر اس مقدس علم تفسیر کا دوسرا مرحلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدس زمانہ میں ہوا، اب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ کے انہیں ارشادات کو مرکزی تفسیر قرار دیا جو کسی نہ کسی واسطہ سے حضور ﷺ سے سنے تھے، ان میں دس جلیل القدر صحابہ کرام اس علمی میدان میں شہسوار مشہور ہوئے۔ ان میں زیادہ شہرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کو ہوئی، ان کے ارشادات سے ہزاروں لوگوں نے فیض حاصل کیا۔

اس مقدس علم، علم تفسیر کا تیسرا مرحلہ صحابہ کرام کے بعد تابعین کرام کا ہوا، ان تابعین نے صحابہ سے فیض حاصل کیا اور اس علم تفسیر کو نہایت محنت اور محبت سے فروغ دینے میں کامیاب ہوئے، ان جلیل القدر مفسرین میں ابوالعالیہ، ضحاک، قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطاء ابن ابی رباح، مجاہد رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے گوہر نایاب سامنے آئے۔ قرآن مقدس کی یہ تفسیری درسگاہیں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بصرہ

اور کوفہ میں معیاری درسگاہیں تھیں۔

مدینہ منورہ کے اندر اس تفسیری درسگاہ کا سنگ بنیاد حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے ہوا، مدینہ منورہ کے تابعین میں محمد بن کعب القرظی، زید بن اسلم، ابوالعالیہ ان دینی خدمات میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ کوفہ میں اس تفسیری دینی درسگاہ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں خاصہ فروغ ہوا۔ اس عظیم مقدس درسگاہ کے حسین اور قابل قدر نایاب گوہر اسود بن یزید، علقمہ بن قیس، عامر شعی درخشاں آفتاب کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقدس دور کے بعد پھر تفسیر لکھنے کا عام سلسلہ چلا۔ علم تفسیر لکھنے والے لوگوں میں جہاں ہزاروں کمال اور خوبیاں دکھائی دیتی ہیں وہاں ایک نقص بھی نمایاں نظر آتا ہے کہ بعض مفسرین نے اپنے کسی ایک پسندیدہ موضوع کو ترجیح دی جس سے محسوس ہوتا ہے شاید قرآن حکیم اُترا ہی اس موضوع کیلئے ہے (اس پر تبصرہ مناسب نہیں سمجھتا) صرف بات کہہ دی ہے۔

ماخذ

تفسیر کا مادہ ”فسر“ سے ہے اس مادہ سے جو لفظ بنتے ہیں ان میں عموماً شرح، وضاحت کے معنی شامل ہوتے ہیں، چنانچہ ماضی کے مصدری معنی ہیں واضح کرنا، تشریح کرنا، مراد بتانا، پردہ ہٹانا ہے، اسی سے تفسیر ہے کیونکہ عبارت کو کھول کر معنی کی وضاحت کی جاتی ہے اسی سے ایک اور لفظ ”تفسره“ ہے جس کا معنی ہے قارورہ۔ تفسرہ اس قارورہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ طبیب مریض کی شناخت کر سکے، اسی طرح ایک اور قرمبی لفظ ہے ”سفر“ جس کا معنی ہے پردہ ہٹانا اور متفرق کرنا چنانچہ عربی کا محارہ ہے ”سفرت المرأة وجهها“ عورت نے چہرہ کھولا۔ اسی طرح ”سفر الصبح“ کے معنی ہیں، روشن ہونا۔ ”سفر الشی“ کا معنی ہے جدا جدا کرنا ایک اور محاورہ بھی مستعمل ہے سفر الريح السحاب ہوانے بادل کو کھول دیا اور سفرہ جھاڑ کو بھی کہتے ہیں کہ وہ بھی مٹی کو ہٹا کر زمین کو کھول دیتا ہے۔ قطع مسافت کیلئے سفر کا نام اس لئے پڑا کہ وہ مسافر کے رخ اور اس کے اخلاق کو ظاہر کرتا ہے۔

جہاں پر حضور ﷺ کی ذمہ داریاں بے شمار تھیں، وہاں پر قرآن مقدس کی تشریح اور تفسیر بھی ذمہ داریوں میں ایک اہم ذمہ داری تھی جس کی طرف قرآن مقدس کا اشارہ واضح ہے۔

☆ و يعلمهم الكتاب

حضور انہیں کتاب سکھاتے ہیں

☆ ولقد انزلنا عليك الذكر لتبين للناس

ہم نے آپ پر قرآن اتارا تاکہ لوگوں کو بیان کریں،

یہی عنوان تیسری جگہ پر اس طرح ہے کہ

☆ لتحكم بين الناس بما اراك الله

ہم نے آپ پر قرآن اس لئے اتارا کہ آپ لوگوں میں فیصلہ کریں جیسے اللہ تعالیٰ

نے (آپ کو سکھایا، پڑھایا)۔

اس مقدس علم کی فضیلت میں بہت سی روایات ملتی ہیں، ایک حدیث پاک میں ہے سورۃ الحدید اور اس کی تفسیر سیکھو۔ حضور ﷺ نے ایک موقع پر حضرت ابن عباس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا، ”تو قرآن پاک کا کتنا اچھا ترجمان ہے۔“ پھر یہ نظام تفسیر صحابہ کے بعد تابعین، تبع تابعین کے دور میں رہا، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گذر چکا۔ اس علم کی فضیلت میں قرآن مقدس کا ارشاد ہے

ومن يؤت الحكمة فقد اوتى خيرا كثيرا

”جو حکمت دیا جاتا ہے وہ خیر کثیر دیا جاتا ہے“

ابن ابی حاتم نے ابن طلحہ کے طریق پر ابن عباس سے اس بارہ میں روایت کی ہے کہ اس سے مراد

قرآن پاک کی معرفت ہے کہ اس میں ناسخ کیا ہے؟ منسوخ کیا ہے؟ حلال و حرام کیا ہے؟

علم تفسیر کے درجات

علم تفسیر وہ مقدس علم ہے جس سے قرآن مقدس کی آیات مبارکہ کا مفہوم مطلب واضح ہو۔ ”فسر“ کا معنی کھولنے کا آتا ہے کہ اس علم سے قرآن مقدس کی آیات کا مفہوم کھل کر سامنے آ جاتا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ تفسیر میں عقل کو دخل نہیں بلکہ اس میں نقل کی ضرورت ہے، قرآن مقدس کی آیات کا خلاصہ اپنی رائے سے کرنا قطعاً حرام ہے۔ حضور سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے اور وہ ٹھیک بھی ہو تب بھی مجرم ہے، خطا کار ہے کہ اس نے اپنی رائے سے کہا، یہ اتفاق ہو گیا کہ وہ ٹھیک نکلا، تفسیر کے کئی درجات ہیں۔

پہلا درجہ: یہ ہے کہ قرآن مقدس کی کسی آیت کی تفسیر قرآن مقدس کی ہی دوسری آیت سے کر دی جائے

دوسرا درجہ: یہ ہے کہ قرآن مقدس کی آیت کریمہ کی تفسیر حدیث پاک سے کر دی جائے۔

تیسرا درجہ: یہ ہے کہ آیت مبارکہ کی تفسیر صحابہ کرام کے اقوال سے ہو۔

چوتھا درجہ: یہ ہے کہ آیت کریمہ کی تفسیر تابعین یا تبع تابعین کے اقوال سے ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

عہد صحابہ کے مشہور مفسرین

اس مقدس گروہ میں یہ صحابہ کرام مشہور مفسر شمار ہوئے ہیں۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔ عہد صحابہ میں سب سے پہلی تفسیر سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے لکھی ان کا انتقال سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت

میں ہوا۔ محمد بن جریر طبری، ابن ابی حاتم نے ان سے بکثرت روایات لی ہیں۔
 اسی طرح ابو عبد اللہ الحاکم نے اپنی مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ نے اپنی مسند میں
 علامہ احمد طالش نے ”مفتاح السعادة“ میں ان کی تفسیر کو خراج تحسین اس طرح پیش کیا ہے۔ اما ابی ابن
 کعب عنه نسخة كبيرة لیکن ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کی تفسیر کا نسخہ بڑا ہے۔
 وصلى الله تعالى على حبيبه سيدنا محمد وعلى آله وصحبه بعدد خلقه

مختلف تفاسیر کا تعارف

تفسیر ابن عباس

چند مشہور تفاسیر میں سرفہرست تفسیر ابن عباس ہے، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وہ عظیم مفسر ہیں جن
 کیلئے حضور ﷺ نے دعا فرمائی تھی، بے شمار صحابہ اور تابعین نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ملت اسلامیہ
 انہیں ترجمان القرآن کے نام سے یاد کرتی ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں، مصر میں ان کی روایات کا
 ایک مستند ذخیرہ موجود ہے۔ آپ صحابہ کرام میں علوم قرآن حکیم کے موضوع پر حجت مانے گئے ہیں۔
 وصلى الله تعالى على حبيبه سيدنا محمد وعلى آله وصحبه بعدد خلقه

تفسیر ابن کثیر

یہ تفسیر حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن الخطیب کی تصنیف ہے۔ اس کا اصل نام تفسیر القرآن
 العظیم ہے۔ تفاسیر ماثورہ میں سے صحیح ترین تفسیر ہے، صحابہ، تابعین کی تمام صحیح روایات نقل کی ہیں، احادیث
 کی نقل میں صحت کا خیال رکھا گیا ہے۔ فقہی اختلافات کے مواقع پر مختلف مذاہب کی تفصیل دی ہے، اس کی
 ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انداز بیان دلنشین ہے، عبارت سادہ ہے، عربی سے بقدر ضرورت واقفیت ہو تو بڑی

آسانی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، انہیں خوبیوں کے باعث یہ کتاب مقبول عام ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

تفسیر طبری

اس کا اصل نام جامع البیان ہے، ابو جعفر طبری کی تصنیف ہے۔ علامہ طبری بے شمار علوم میں بلند مقام رکھتے تھے ان کی یہ کتاب تفسیر قرآن حکیم کا جامع ذخیرہ ہے اس تفسیر کی کئی خصوصیتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ مصنف نے تمام مختلف قرأتوں کو منضبط کیا ہے اور تفسیر کے بارہ میں جس قدر احادیث ملیں، جمع کی ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

تفسیر کبیر

یہ کتاب ابو عبد اللہ بن محمد بن عمر بن حسین کی تصنیف ہے۔ آپ فخر الدین رازی کے لقب سے مشہور ہوئے، علامہ فخر الدین علیہ الرحمہ ایک زبردست عالم تھے نقلی، عقلی علوم پر خاصی دسترس تھی، معتزلہ کی تردید میں ان کے فاضلانہ جوابات مشہور عام ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی بڑی واضح ہے کہ اس میں سوال و جواب کی شکل میں مسائل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، آپ کا یہ طریقہ نہایت حسین اور دلنشین ہے آپ نے اپنی اس کتاب میں معتزلہ اور ملحدین کے سوالات کو نہایت واضح اور کھول کر بیان کیا اور پھر ترتیب وار مکمل جوابات بیان کئے، امام رازی ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے، ستر سے زائد کتابیں لکھیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

تفسیر ابن عربی

یہ کتاب شیخ اکبر ابن عربی کی تالیف ہے اور اس عنوان پر لکھی گئی ہے کہ قرآن پاک کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو ظاہری ہے اور ایک مفہوم باطنی ہے اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا

لکل آیہ ظہر و بطن (ہر آیہ کا ایک ظاہر ہے ایک باطن)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ بعدد خلقہ

تفسیر قرطبی

یہ کتاب ابو عبد اللہ بن محمد احمد انصاری کی تصنیف ہے، اس کا اصل نام الجامع لاحکام القرآن ہے۔ آپ نے اس میں تمام تفسیری پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ البتہ تاریخی واقعات بیان کرنے کی نسبت احکام القرآن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، مصنف مالکی مذہب کے پیروکار تھے، اس لئے انہوں نے فقہی مسائل میں عام طور پر اپنے حق میں دلائل دئے ہیں اس کے علاوہ نسخ منسوخ کی بحثوں کو بھی اچھا بیان کیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ بعدد خلقہ

تفسیر روح المعانی

یہ کتاب علامہ سید محمود آلوسی علیہ الرحمہ کی کتاب ہے، یہ دس ضخیم جلدوں میں ہے آپ نے فقہ کلام تصوف اور عقائد پر ہر لحاظ سے کلام کیا ہے، یہ متقدمین کی طرز پر لکھی ہوئی تفاسیر کا آخری نمونہ ہے اس کی جامعیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے اہل تصوف کے ایسے اہم نکات بھی نقل کئے ہیں جو بعض کوتاہیوں کے باوجود مقبول عام اور جامع تفسیر ہے۔ اسی انداز کی ایک دوسری تفسیر روح البیان بھی ہے، جو علامہ اسماعیل حق کے قلم حق سے لکھی گئی اور مقبول عام ہوئی۔ علامہ طحاوی کی تفسیر ”الجواہر“ جو اسی تسبیح کا ایک حسین دانہ ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ بعدد خلقہ

قرآن مقدس پر لکھنے والے بعض اکابر

قرآنی خدمات انجام دینے کا حوصلہ ہونے پر ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض عظیم اہل قلم کی خدمات قرآنیہ کا

ذکر کروں جن کے علم و فضل اور اُن کے لہلہاتے کھیتوں سے مجھے خوشہ چینی کا موقع ملا اور ان کے باغوں سے پھول اکٹھے کر کے گلہستہ بنانے کی ہمت ہوئی۔

قرآن مقدس کے پڑھنے، سمجھنے کیلئے آج تک ہزاروں تفاسیر لکھی گئیں، قیامت تک لکھی جاتی رہیں گی یہ اسی کتاب قرآن مقدس کا کمال ہے۔ توراۃ، انجیل، زبور اس کتاب سے صدیوں پہلے ہیں مگر ان کی طرف توجہ، دھیان اور تفسیری معاملات میں دلچسپی اس کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ قرآن مقدس کے اس تفسیری پہلو کے علاوہ علوم قرآنیہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اس موضوع پر حصول تہرک کیلئے اُن چند مصنفین اور کتب کے نام درج کر کے اپنی اس کتاب کے حسن کو دوبالا کرنا چاہتا ہوں۔

امام ابوالحسن اشعری علیہ الرحمہ نے ”المختزن فی علوم القرآن“ کے نام سے ایک جامع کتاب لکھی۔ امام ابوبکر بھٹائی نے ”غریب القرآن“ کے موضوع پر امام ابومحمد القصاب محمد بن علی کرنی نے ”نکھت القرآن“ کے عنوان سے امام محمد بن علی افوی نے ”الاستغناء فی علوم القرآن“ کے نام سے ۲۰ جلدوں میں کتاب لکھی، قاضی ابوبکر محمد بن طیب باقلانی نے ”اعجاز القرآن“ کے نام سے (الدبیاج ص ۱۹۵) امام بخاری کے استاذ امام ابوجعفر علی بن عبداللہ المدینی نے ”اسباب النزول“ کے عنوان سے (تذکرۃ الحفاظ ص ۱۵ ج ۲) کتاب الاحوال کے مصنف امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام نے نسخ و منسوخ کے عنوان سے، امام محمد بن ایوب الفریس نے ”فضائل قرآن“ کے نام سے، پھر محمد بن خلف مرزبان نے ۲۷ جلدوں میں ”الحاوی فی علوم القرآن“ ابوبکر محمد بن قاسم الانباری علیہ الرحمہ نے ”عجائب علوم القرآن“ پر قلم اٹھایا جو زبردست کامیاب رہا، اس کا ایک نسخہ اسکندریہ کے مکتبہ البلدیہ میں موجود ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں امام علی بن ابراہیم سعید الحوفی نے ایک عظیم کتاب ”البرہان فی علوم القرآن“ لکھی جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے (الاقان ص ۱۹۵ ج ۱) پھر اس صدی میں شیخ ابو

القاسم ہیۃ اللہ ابن سلامہ نے ”الناسخ والمنسوخ“ کے عنوان پر ضخیم کتاب لکھی، امام ابو عمر الدانی نے ”التیسیر فی القراءة السبع“ اور ”المحکم فی النقط“ کے نام سے دو ضخیم کتابیں لکھیں، امام ابو القاسم عبدالرحمن سیہلی نے ”مبہمات القرآن“ کے عنوان سے قلم اٹھایا، محدث ابن جوزی علیہ الرحمہ نے ”فنون الافنان فی عجائب القرآن“ ترتیب دی۔ ابو محمد عبدالعزیز بن عبدالسلام نے ”مجاز القرآن“ کے نام سے تصنیف کی، امام علی بن محمد علم الدین السخاوی نے ”علم القراءة“ کے موضوع پر امام جلال الدین نے ”الاتقان“، امام نجم الدین طونی کے قلم نے خاصہ کام کیا، امام ابو شامہ نے ”المرشد الوجیز“ کے نام سے عظیم خدمات انجام دیں، امام ابو عبد اللہ محمد بن برکات نے ”سعدی الایجاز“ کے نام سے تالیف کی جس میں ناسخ و منسوخ کے عنوان سے خاصہ مواد فراہم کیا، امام بدر الدین زرکشی نے ”البرہان فی علوم القرآن“ کے نام سے ضخیم کتاب تصنیف کی، امام جلال الدین بلقینی، امام محمد بن سلیمان کافبی، امام جلال الدین سیوطی، امام واحدی نے ”اسباب النزول“ کے عنوان پر زبردست کام کیا، امام جلال الدین سیوطی نے ”التبہیر فی علوم التفسیر“، ”الاتقان فی علوم القرآن“ کتابیں لکھیں، شیخ طاہر الجزیری کی ”التبیان“، محمد عبدالعظیم زرقانی کی ”مناہل العرفان“ محمد علی سلام کی ”منہج العرفان“، مصطفیٰ صادق الرافعی کی ”اعجاز القرآن“، شیخ مالک بن نبی کی ”الظاہرۃ القرآنہ“، الشیخ محمد غزالی کی ”نظرات فی القرآن“، محمد مبارک و مشقی کی ”منہاج القرآن“، محمد عبداللہ درازی کی ”اسناء العظیم“ عظیم خزانہ ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

علم تفسیر کے متعلق مختلف آراء

تفسیر کے متعلق امام زرکشی فرماتے ہیں کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے حضور ﷺ پر اتاری ہوئی کتاب قرآن مقدس کے معانی سمجھے جاتے ہیں اور اس کے احکام و مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

(الاتقان ص ۱۷۴، ج ۲)

”اتقان“ کے اسی مقام پر دوسری تعریف اس طرح درج ہے ”تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں قرآنی آیات کے نزول، ان کے واقعات، اسباب نزول، مکی، مدنی، محکم، متشابہ، ناسخ منسوخ، خاص و عام، مطلق، مقید، مجمل، مفسر، حلال و حرام وعد، وعید اور امر و نہی وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے“ (الاتقان ص ۱۷۴، ج ۲)

اس مقدس علم تفسیر کے بارہ میں ایک رائے یہ بھی ہے ”تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے تلفظ ان کے مفہوم و مدلول ان کے احکام و مفہوم و ترکیبی اور معانی سے بحث کی جاتی ہے“

(البحر المحیط ص ۱۳، ج ۱)

تفسیر کے معنی کے سلسلہ میں امام ماتریدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ”تفسیر کے معنی قطعیت و یقین کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ اس لفظ کے یہی معنی ہیں اور خداوند قدوس جل مجدہ نے یہی مفہوم مراد لیا ہے اگر اس کی کوئی حتمی دلیل موجود ہو تو پھر تو ٹھیک ہے ورنہ تفسیر بالرائی ہوگی جو شرعاً ممنوع ہے“ (الاتقان ص ۱۷۳، ج ۲)

اس مقدس علم کی اہمیت کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن مقدس ہر رطب و یابس کو جامع ہے، پورے کا پورا دین اس میں ہے اب اس بحر بے کنار میں غوطہ لگا کر ہیرے موتی نکالنا ایک عظیم سعادت ہے، قرآن مقدس عظیم علمی خزانوں سے بھرپور ہے۔ اس عظیم علمی خزانے کو دیکھنے، ہیرے جواہرات نکالنے کیلئے علم تفسیر اس علمی خزانے کی کنجی ہے، جس کے بغیر قرآن مقدس کے علوم و معارف کا دروازہ کھولا نہیں جاسکتا۔ قرآن مقدس کے الفاظ مبارکہ کو پڑھنے سے ثواب تو ملے گا مگر علمی دروازہ اسی وقت کھلے گا جب علم تفسیر کا سہارا لیا جائے گا۔ تفسیر کے معنی کشف و اظہار کے ہیں اس علم میں قرآن مقدس

کے مطالب و معانی کی وضاحت کی جاتی ہے اس لئے یہ علم اسی نام سے موسوم ہو گیا، اگرچہ دوسرے علوم میں بھی اظہار کشف کا وجود ملتا ہے مگر یہ نام اسی علم کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ (تاریخ تفسیر ص ۳۵)

تفسیر کی ایک صورت یہ بھی ہے جس میں مشکل الفاظ کو حل کیا جاتا ہے، جملوں کی نحوی حالت بتائی جاتی ہے، بلاغت کے نکات اور فنی اشارات کے ذکر و بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس قسم کا تعلق علم تفسیر احکام و ہدایات سے ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ علم تفسیر کی دوسری صورت ان قیود سے بلند ہے اس قسم کا نصب العین، ہدایات و تعلیمات پر روشنی ڈالنا ہے اور اسلامی شریعت کے اسرار و رموز کو ایسے طریقے سے واضح کرنا ہے جو روح کیلئے پرکشش ہو جس سے شرح صدر نصیب ہو اور قاری ہدایت الہیہ کی طرف کھینچا چلا جائے، صحیح معنی میں یہی تفسیر ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

لفظ تاویل کے معانی

لفظ تاویل کے متعلق کئی آراء سامنے آتی ہیں، بعض علماء لفظ تاویل کو ”ایالہ“ سے لیا ہے جس کا معنی آتا ہے حکمرانی کرنے کا۔ گویا تاویل کرنے والا کلام پر حکمرانی کرتا ہے اور اسے مناسب مقام پر رکھتا ہے جیسے کہ علامہ زمخشری اسی معنی کے متعلق دلیل کے طور پر لکھتے ہیں ”آل الرعیۃ ایالۃ حسنہ“ اس نے رعیت پر اچھی طرح حکمرانی کی۔ لفظ تاویل کا معنی رجوع کرنے کا بھی آتا ہے جیسے صاحب قاموس نے لکھا ہے ”آل الیہ اول“ رجوع کرنا کہ تاویل کرنے والا اپنے اس معنی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ایک معنی منحرف ہونے کا بھی آتا ہے کہ تاویل کرنے والا اپنے مرادی معنی کے علاوہ سب سے منحرف ہو جاتا ہے اور اپنے اس مرادی معنی کی طرف رجوع کرتا ہے

(لسان العرب ص ۲۳، ج ۱۳)

لفظ تاویل کا ایک معنی اظہار و بیان کا بھی ہے

لفظ تاویل قرآن مجید میں متعدد مقامات پر وارد ہے، سورہ یوسف میں ہے ”و کذلک

یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث “ دوسری جگہ اس طرح ہے ” ذالک تاویل ما لم تسطع علیہ صبرا “ (سورہ کہف)

بعض علماء نے تاویل کے معنی یہ بھی بیان کئے ہیں کہ کلام کے معنی و مفہوم کو واضح کرنا وہ وضاحت ظاہر کلام کے موافق ہو یا مخالف، اس معنی میں تفسیر اور تاویل دونوں ایک معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ بعض علماء نے یہ کہا ظاہر معنی کو ترک کر کے اپنے ترجیحی معنی مراد لینے کو تاویل کہتے ہیں، البتہ تاویل کرنے والے پر یہ لازم ہوتا ہے جو معنی وہ مراد لے رہا ہے وہ ثابت کرے کہ آیا وہ لفظ اس معنی کیلئے استعمال بھی ہوتا ہے یا نہیں، تاویل کرنے والے پر دوسری بات یہ بھی لازم ہے کہ وہ بتائے کہ ظاہر اور رائج معنی مراد لینے میں رکاوٹ کیا ہے کہ وہ دوسری تاویل کر رہا ہے اگر تاویل کرنے والا یہ دونوں باتیں ثابت نہیں کر سکتا تو اس کی تاویل باطل ہوگی۔

لفظ تاویل کے سلسلہ میں مزید بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ کسی کلام میں چند احتمال ہوں ان میں سے کسی احتمال کو علمی دلائل سے ترجیح دینا یا اس پر علمی نکات بیان کرنا تاویل ہے ﴿اس معنی میں نقل کی ضرورت نہیں بلکہ ہر عالم اپنی علمی قوت سے نکات بیان کر سکتا ہے بشرطیکہ یہ علمی موشگافیاں شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہوں، جیسے بڑے بڑے علماء، محققین اپنے علمی، عقلی دلائل سے اپنے کلام کو مزین کرتے ہیں اور ان علمی نکات کو بیان کرنے کیلئے کسی نقل کی ضرورت نہیں جیسے امام محمد غزالی، محی الدین ابن عربی، ایسے کئی صاحبانِ علم نے یہ کیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

نزول وحی کی کیفیتیں

قرآن مقدس بذریعہ وحی نازل ہوا وحی نازل ہونے کی کئی کیفیتیں پیش آئیں۔ وحی اترنے کی ایک کیفیت یہ بھی ہوئی ہے فرشتہ وحی کو گھنٹی کی آواز کی طرح لاتا ہے جیسے کہ صحیح بخاری شریف میں وارد ہے۔

حضور سید عالم ﷺ سے عرض کی گئی حضور نزول وحی کی صورت کیا ہے؟ تو فرمایا ”احیاناً یا تینی کصلصلة الجرس“ کبھی فرشتہ اس کو گھنٹی کی آواز کی طرح لاتا ہے۔

کبھی نزول وحی کی یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ نبی کریم ﷺ کے قلب انور میں کلام الہی پھونک دیا جاتا تھا، جیسے حضور ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ”ان روح القدس نفث فی روعی او کما قال ﷺ“ بے شک روح القدس نے میرے دل میں پھونک ماری ہے۔ کبھی نزول وحی کی یہ صورت بھی ہوتی کہ فرشتہ انسانی شکل میں حاضر ہوتا اور قرآن مقدس سناتا۔ ابو عوانہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا نزول وحی کی یہ صورت مجھ پر آسان ترین صورت ہے۔ کبھی نزول وحی کی یہ صورت بھی ہوتی کہ فرشتہ اپنی اصل شکل میں حاضر ہوتا اور قرآن سناتا، غار حرا میں فرشتہ اپنی اصلی شکل میں ہی آیا تھا، اس کے عظیم جسم نے زمین و آسمان کے درمیان کو ہر کر رکھا تھا حضور ﷺ نے حقیقت جبریلی کو بنظر غائر ملاحظہ فرمایا۔ طبقہ صوفیاء کے ایک عظیم صوفی مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ اس مقام پر فرماتے ہیں، حضور ﷺ نے تو جبریل علیہ السلام کی حقیقت کو اچھی طرح دیکھ لیا اور بے خود نہ ہوئے اگر جبریل علیہ السلام حقیقت محمدیہ کو دیکھ لیتے تو قیامت تک بے خود ہی رہتے۔

احمدار بکشاید آں پر جلیل تاابد بے ہوش ماند جبریل

نزول وحی کی ایک صورت یہ بھی ہوئی ہے کہ کبھی فرشتہ سونے کی حالت میں حاضر ہوتا تھا، علماء نے سورہ کوثر کو اسی قسم کی وحی سے قرار دیا ہے اور پھر ”رویہ الانبیاء وحی“ انبیاء کی خواب بھی وحی ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے، قرآن مقدس نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے ”یا بنی انی ارئ فی المنام انی اذبحک“ پیارے بیٹے میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ خواب سنتے ہی جناب اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد گرامی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے عرض کی ”یابن افعل ما توامر“ ابا جان وہی کچھ کر گزریئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے، ”تو مر“ کے ارشاد سے

واضح ہے نبی کو خواب میں ذبح اسماعیل کا حکم دیا گیا ہے یہ وحی منامی کہلاتی ہے۔

کبھی عطاء قرآن کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ بیداری کی حالت میں فرشتے کے واسطہ کے بغیر آیات قرآنی عطا ہوئی ہیں جیسے سورہ بقرہ کی آخری آیات مقدسہ ہیں۔ یہ ساری مختلف صورتیں چھ کیفیتوں میں ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وحی کے معنی

وحی وہ ارشاد خداوندی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرماتا ہے، وحی کا معنی راز کے ساتھ خبر دینے کا بھی ہے اسی معنی کی روشنی میں بعض نے الہام کو بھی وحی کہا ہے لفظ وحی اشارہ کرنے اور لکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لفظ وحی القاء کے معنی میں بھی وارد ہے۔ قرآن مقدس فرماتا ہے ”و اوحی ربک الی النحل“ تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی۔ یہاں پر وحی کا معنی القاء کا ہے۔ کہ تیرے رب نے شہد کی مکھی کو القاء کیا۔ لفظ وحی الہام کے معنی میں بھی قرآن مقدس میں اس طرح وارد ہے۔ ”و اوحینا الی ام موسیٰ“ ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی یعنی الہام کیا۔ انبیاء علیہم السلام کیلئے یہ وحی کبھی فرشتے کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسے جبریل علیہ السلام حاضر ہوتے اور احکام سناتے، کبھی یہ وحی جبریل علیہ السلام کے دکھائی دیے بغیر سنائی جاتی ہے جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کلام الہی کو سنا ہے، کبھی دل میں بات ڈالنے کو بھی وحی کہا گیا ہے۔

وحی کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم ”وحی متلو“ متلو کا معنی تلاوت کی گئی، یہ وحی قرآن مجید ہے جس کے الفاظ، معانی سبھی کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ یہ وحی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے۔ وحی کی دوسری قسم ”وحی غیر متلو“ جس کی تلاوت نماز میں نہیں کی جاتی، اس وحی میں حضور ﷺ پر مفہوم، معانی نازل کئے جاتے ہیں مگر اس کے الفاظ بیان کرنے میں حضور ﷺ کو اختیار ہے جیسے چاہیں ارشاد فرما

دیں، اسے حدیث شریف کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نزول وحی کی کئی صورتیں ہیں خواب میں واقعہ دکھا دیا جائے، دل میں القاء کیا جائے، گھنٹی کی آواز میں جبریل حاضر ہوں، انسانی شکل میں جبریل علیہ السلام حاضری دیں (جیسے دحبہ کلبی کی شکل میں آنا واضح ہے) کبھی جبریل علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر بھی وحی ہوئی، جیسے معراج کی شب ”فاوحی الیٰ عبدہ ما اوحیٰ“ یہاں جبریل علیہ السلام کا واسطہ نہیں سورہ بقرہ کی آخری آیات بھی معراج کی رات عطا ہوئیں، جبریل کا واسطہ نہیں۔

(علم القرآن ص ۶۳ ج اول)

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

نزول قرآن کریم کی تین صورتیں

پہلی صورت تو یہ ہے کسی چیز پر لکھا جائے اور اس چیز کو منتقل کر دیا جائے۔ پہلی آسمانی کتابوں کا نزول اسی طرح ہوا کہ الواح پر لکھ دی گئیں اور پھر فرشتہ کے ذریعہ تختیاں نبی تک پہنچا دی گئیں جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر لکھی ہوئی تختیاں دے دی گئیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کے ذریعہ یہ بات کہلا کر بھیج دی جائے اس صورت میں حرکت کرنے والا وہ آدمی ہوگا اور وہ کلام اس کے ذریعہ سے حرکت کرے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بغیر کسی واسطہ کے سننے والے سے بات کر لی جائے۔

قرآن مقدس کا نزول دوسری اور تیسری صورت میں ہوا ہے۔ سیدنا جبریل علیہ السلام حاضر ہوتے تھے اور آکر آیات قرآنیہ سناتے تھے یہ نزول بذریعہ قاصد ہوا اور بعض آیات مقدسہ جبریل علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر ہی عطا ہوئیں جیسے سورہ بقرہ شریف کی آخری آیات مقدسہ حضور ﷺ کو معراج کی رات عطا ہوئیں۔ لہذا قرآن مقدس کا نزول دوسری آسمانی کتابوں کی نسبت نہایت احسن اور نہایت شاندار طریقے سے ہوا ہے۔ لکھے ہوئے ایک حرف کے کئی مختلف معانی ہو سکتے ہیں جس کے سمجھنے کے لئے

محنت، فکر و علم سے کام لینا پڑتا ہے مگر کبھی ہوئی بات کا مفہوم بہت جلد واضح ہو جاتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

نزول قرآن کریم کے کئی مراحل

نزول قرآن حکیم کے سلسلہ میں کئی مراحل نظر آتے ہیں اور ان مراحل کی طرف خود قرآن مقدس نے ارشاد فرمایا ہے۔

پہلا مرحلہ

قرآن مقدس لوح محفوظ سے آسمان اول کی طرف اتارا گیا۔ یہ نزول مبارک رمضان المبارک کے مہینہ کی مبارک رات شب قدر میں ہوا، قرآن مقدس فرماتا ہے

”انا انزلنہ فی لیلة القدر“

بے شک ہم نے اسے شب قدر میں اتارا

ایک دوسرے مقام پر بھی اسی نزول کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے

”شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن“

رمضان کا مہینہ وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآن پاک اتارا گیا ہے۔

لوح محفوظ سے آسمان اول پر یکبارگی نزول ہوا۔ لوح محفوظ سے آسمان اول تک ایک ہی مرتبہ اتارنے میں حکمت یہ محسوس ہوتی ہے۔ کہ قرآن مقدس کو قریب کر دیا جائے جب رحمت باری کا دروازہ کھلے تو قرآن اور صاحب قرآن ﷺ اکٹھے ظاہر ہوں۔ علامہ سخاوی علیہ الرحمہ کی نظر میں ایک حکمت اور بھی ہے کہ فرشتوں کی نظر میں آدمیوں کا مقام بڑھ جائے۔

دوسرا مرحلہ

قرآن مقدس آسمان اول سے زمین پر ۲۳ برس میں تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوتا رہا اور یہ مرحلہ متعدد احادیث طیبہ سے واضح ہے۔ قرآن مقدس کے نزول کے سلسلہ میں قرآن پاک میں ہی دو لفظ آئے ہیں ”انزلنا“ ”نزلنا“ ”انزلنا“ کا معنی ہے یکبارگی اتارنا، جیسے لوح محفوظ سے آسمان اول تک ایک ہی مرتبہ اتارا گیا۔ نزلنا کا معنی ہے آہستہ آہستہ اتارنا جیسے آسمان اول سے حضور ﷺ تک ۲۳ برس میں حسب ضرورت اترتا رہا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

تفسیر کے لئے ضروری معلومات

زرکشی نے اپنی کتاب ”البرہان“ میں لکھا ہے تفسیر کی جستجو کی غرض سے قرآن مقدس میں غور کرنے والے شخص کے لئے ضروری ہے کہ حدیث شریف سے واقفیت رکھتا ہو، قول صحابی سے متعارف ہو علم لغت سے آشنائی ہو کہ قرآن مقدس کا نزول عربی زبان میں ہوا ہے اور کسی زبان سے واقفیت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس کی لغت سے متعارف ہو، علم اصول دین سے متعارف ہو یا علم اصول فقہ، علم ناسخ و منسوخ، علم فقہ، مسائل شرعیہ کا استدلال کرنے پر قدرت ہو۔ جس قدر ان علوم پر دسترس ہوگی اسی قدر تفسیر لکھنے میں آسانی ہوگی جس قدر کمزوری ہوگی قدم قدم پر الجھاؤ ہو سکتا ہے قدم قدم پر لغزش کا احتمال ہے۔ ان علوم پر دسترس نہ ہونے کی صورت میں مطالعہ کی شدید ضرورت، دقت کی وسعت متقدمین مفسرین کی ہر لمحہ راہنمائی کے بغیر اس عظیم سمندر کو پار کرنے میں شدید دشواریاں سامنے آ سکتی ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

جمع و ترتیب قرآن حکیم

جمہور علماء کے ہاں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ جس طرح قرآن مقدس کی ہر آیت اور ہر ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی طرح قرآن مقدس کی آیات اور سورتوں کی ترتیب بھی الہامی ہے۔ جو حصہ نازل ہوتا حضور ﷺ لکھوادیتے یہ بات ظاہر ہے حضور ﷺ قرآن مقدس نازل ہونے کی ترتیب سے نہیں لکھواتے تھے بلکہ وحی الہی کے مطابق ربط سے مناسب مقام پر آیات کو لکھوادیتے تھے۔ جیسے ابوداؤد شریف کی ایک حدیث شریف سے یہ واضح ہے حضور ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو کسی کا تب کو بلا کر فرماتے اس آئیہ کو فلاں سورۃ میں لکھ لو۔ یہ حکم الہام پر مبنی ہوتا تھا۔ جمع و ترتیب پر غیر الہامی ہونے کا شبہ کرنا قطعی غلط ہے۔ جمع القرآن کے کئی مراحل ہیں۔

پہلا مرحلہ

حضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں قرآن مقدس مختلف اشیاء کے ٹکڑوں پر لکھوادیا جاتا تھا درختوں کے پتے، کھال کے ٹکڑے، اونٹ کے شانہ کی ہڈی وغیرہ۔ جیسے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضور ﷺ کے مقدس زمانہ میں قرآن پاک کسی ایک شے پر جمع نہیں کیا گیا جس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں پہلی وجہ یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اکثریت کو زبانی یاد تھا ضائع ہونے کا اندیشہ ہی نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جہاد اور دوسری دینی ضروریات کی وجہ سے اس طرف توجہ کا موقع نہ مل سکا۔ تیسری وجہ یہ کہ قرآن پاک کا نزول ابھی جاری تھا اور جب تک مکمل نہ ہوتا جمع کرنا مشکل تھا و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد و علیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

دوسرا مرحلہ

جمع القرآن کا دوسرا مرحلہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ سے سیدنا صدیق

اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا جب مسیلمہ کذاب سے جنگ ہوئی اور سینکڑوں حفاظ کرام شہید ہو گئے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی اگر حفاظ کرام کی شہادت کا مسئلہ اسی طرح رہا تو قرآن مقدس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اور قرآن مقدس کے جمع کرنے کی رائے پیش کی۔ پہلے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا کہ یہ ایک بدعت ہے حضور ﷺ کے زمانہ میں جو کام نہیں کیا گیا وہ اب کیوں کیا جائے آخر وہ ایسا کرنے پر راضی ہو گئے (یہ بدعت حسنہ تھی) جیسے قرآن حکیم کے اعراب رکوع، پارہ، نصف، ثلث، ربع۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ نے یہ کام ایک کمیٹی کے سپرد کیا جس کی صدارت سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ سیدنا زید بن ثابت جلیل القدر صحابی ہونے کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کے کاتب وحی بھی رہے تھے اس طرح سے قرآنی حقائق و معارف کو اچھی طرح جان پہچان بھی چکے تھے ان کی قیادت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہونے کا احتمال بھی تھا۔

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں قرآن کریم کے جمع کرنے کی نسبت پہاڑ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا مجھے آسان دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کام کو اس طرح شروع کیا کہ مختلف مقامات سے مختلف ٹکڑے اور حصے اکٹھے کرنا شروع کئے۔ اس کے لئے عراق، یمن، شام وغیرہ کے علاقوں سے بھی رابطہ کیا۔ ظاہر ہے دور دراز علاقوں سے یہ منگوانا کوئی آسان کام نہ تھا آپ فرماتے ہیں۔ سورۃ توبہ کی آخری آیات تلاش کرنے میں مجھے بڑی دقت پیش آئی آخر وہ آیات حضرت ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر سے مل گئیں اور اس طرح یہ اہم کام آسان ہو گیا اور یہ مختلف مقامات سے اکٹھے کئے گئے صحیفے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دئے گئے جو آپ کے وصال تک آپ کے پاس رہے۔ آپ کے وصال کے بعد ان کی حفاظت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے رہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے بعد اس عظیم امانت کی حفاظت فاروق اعظم کی صاحبزادی ایمانداروں کی ماں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی رہیں اگر کسی کو ضرورت پیش آتی تو وہ

تحقیق کر لیتے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

تیسرا مرحلہ

جمع قرآن حکیم کا تیسرا مرحلہ خلافت راشدہ کے تیسرے دور میں پیش آیا۔ جب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آرمینہ، آذربائیجان کی فتح کے موقع پر شامی اور عراقی فوجوں کو اکٹھا ہو کر جنگ میں صف آرائی کرنا پڑی تو وہاں دونوں فوجی ممالک کے مسلمانوں کا قرآن حکیم کی قرأت میں اختلاف معلوم ہوا۔ اس صورت حال کو سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محسوس کر لیا اور خطرہ سمجھا کہیں اختلاف بڑھ نہ جائے۔ آپ نے اپنے ان خطرات کا ذکر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا اور درخواست کی کہ آپ ان خطرات کا سد باب فرمائیں تو آپ نے پسند فرمایا اور وہ نسخہ جو سیدہ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس محفوظ تھا وہ منگوا لیا تاکہ اس کی نقول شائع کی جاسکیں اور امت مسلمہ میں پیدا ہونے والا افتراق رک جائے۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے صحائف مل جانے پر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص، عبداللہ، حسان بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نقل کرنے پر مامور کیا۔ یہ تینوں بزرگ خاندان قریش سے تعلق رکھتے تھے غالباً ان کے انتخاب میں یہ حکمت بھی تھی کہ قرآن پاک لغت قریش پر نازل ہوا اور یہ اہل لغت تھے۔ اس سہ رکنی کمیٹی نے بڑی محنت سے کام کیا یہ نقول ممالک اسلامیہ میں پھیلا دی گئیں اور دوسرے نسخے تلف کر دیے گئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

محکمات و تشابہات

قرآن مقدس کی آیات مبارکہ دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ پہلی قسم محکمات کی ہے اور دوسری قسم تشابہات کی آیات مبارکہ کی اس تقسیم کی طرف قرآن مقدس کا واضح اشارہ ہوتا ہے۔

”هو الذى انزل عليك الكتاب منه آيات محكمات هن ام الكتاب و اخر متشابہات“

”وہ اللہ جس نے آپ پر کتاب اتاری جس میں سے کچھ آیات محکمات ہیں“

جو کتاب کا اصل ہیں اور کچھ دوسری تشابہات ہیں

اب یہ کیسے پتہ چلے کہ کون سی آیات محکمات میں سے ہیں اور کون سی تشابہات میں سے۔ تو اس پہچان کے سلسلہ میں کئی اقوال ملتے ہیں۔

1- ایک قول یہ ہے جس امر کی مراد صاف طور پر معلوم ہو جائے وہ محکم ہے اور جس کا علم اللہ تعالیٰ نے

اپنے لئے ہی خاص فرمایا وہ تشابہ ہے۔

2- دوسرا قول یہ ہے جس کے معنی واضح اور کھلے ہیں وہ محکم ہے اور جو اس کے برعکس ہے وہ تشابہ ہے۔

3- اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا کہ جس امر کی ایک ہی وجہ پر تاویل ہو سکے وہ محکم ہے اور جس کی تاویل

میں کئی احتمال ہوں وہ تشابہ ہے۔

4- یہ بھی کہا گیا ہے جسے واضح طور پر عقل تسلیم کرے وہ محکم ہے جس کے معنی پیچیدہ ہوں اور عقل

ڈمگائے وہ تشابہ ہے۔

5- ایک قول یہ بھی ہے جو شئی بذاتِ خود مستقل ہے وہ محکم ہے جو سمجھنے میں غیر کی محتاج ہے وہ تشابہ ہے

6- یہ بھی ایک قول ہے جس کے الفاظ مکرر نہ آتے ہوں وہ محکم ہے اور جو بار بار آتے ہوں وہ تشابہ ہے

7- بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ وہ آیات جو فرائض وعد، وعید سے متعلق ہیں وہ محکمات اور جو

واقعات اور قصص سے متعلق ہیں وہ تشابہات۔

8- ایک مشہور اور متعارف فرق یہ بھی بیان کیا گیا ہے، قرآن مقدس میں حلال و حرام، حدود و فرائض کا نام محکم ہے۔ منسوخ، مقدم موخر، امثال کا نام تشابہہ ہے۔

9- ایک فرق یہ بھی کیا گیا ہے جو آیات منسوخ نہیں ہوئیں وہ محکمات ہیں اور جو منسوخ ہو گئیں وہ تشابہات ہیں۔

10- یہ بھی کہا گیا کہ محکم قرآن مقدس کا وہ حصہ ہے جس کے معنی واضح اور صاف ہیں تشابہہ وہ حصہ ہے جس کے معنی واضح، صاف اور کھلے نہ ہوں۔ (علم القرآن ص ۱۴۲ ج ۱)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

تشابہات کی حکمتیں

☆ آیات تشابہات میں ایک حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ معنی یا مراد کی تہہ تک پہنچنے کے لئے محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے اور قرآن حکیم کے معانی سمجھنے کے لئے جس قدر محنت ہوگی اجر و ثواب بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔

☆ دوسری حکمت یہ محسوس ہوتی ہے اگر سارا قرآن حکیم محکم ہی ہوتا تو کوئی آدمی جو اسلام سے وابستگی نہیں رکھتا وہ قرآن کریم کی طرف مائل نہ ہوتا۔ اب وہ تشابہہ کے معانی میں سرگرداں ہوگا تو اسے تشابہات کی تشریح محکمات سے مل جائے گی تو یہ اپنے غلط نظریات سے ہٹ کر حق کی طرف مائل ہوگا۔

☆ تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ قرآن مقدس میں تشابہات کے وجود سے تاویل کے طریقوں کا علم ہوا اور بعض آیات کو دوسری پر ترجیح دینے کے اصول معلوم ہوئے اور اسے معلوم کرنے کے لئے بیان، اصول فقہ، نحو ایسے علوم کی ضرورت ہوگی انہیں تشابہات کی وجہ سے اس طرف توجہ ہوئی۔

☆ چوتھی حکمت یہ بھی ہے کہ قرآن مقدس ہر طبقہ کو اپنی طرف متوجہ فرماتا ہے اگر تمام آیات محکمات ہوتیں تو گہرے راز معلوم کرنے کے متلاشی افراد کے لئے یہ توجہ کا مرکز نہ بنتا اب تشابہات پر نظر کرنے

سے اُسے اپنی علمی حقیقت کا پتہ چلے گا کہ فصاحت و بلاغت قرآن مقدس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس طرح سے اپنا علمی تکبر و غرور ختم ہوگا۔

☆ پانچویں حکمت یہ بھی ہے کہ مخاطب کو تنبیہ کر کے متوجہ کر لیا جائے اور تلاوت سنادی جائے وہ عرب جو اپنے کو فصیح و بلیغ کہتے تھے انہیں متشابہات سے ورطہ حیرت میں ڈال دیا جائے۔

☆ چھٹی حکمت یہ بھی ہے کہ قرآن مقدس کی مثل لانے کا دعویٰ کرنے والے عاجز ہوں گے۔

☆ ساتویں حکمت یہ بھی ہے کہ لوگ بغیر تحقیق کے ایمان لائیں تاکہ بندوں میں عجز ثابت ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ناسخ و منسوخ

قرآن مقدس کا مطالعہ کرنے والے اور تفسیر سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مقدس کے اندر ناسخ و منسوخ کے مسئلہ کو بھی جانے۔ قرآن مقدس نے اس نسخ کی حکمت کو خود اس طرح واضح فرمایا۔

”ما ننسخ من آية او ننسخها نأت بخیر منها“

”جو حکم آیت جب ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا

اس کی مثل دوسری لاتے ہیں“

جو حکم پہلا تھا وہ منسوخ کہلایا اور دوسرا ناسخ کہلایا۔ ایسا کرنے میں کئی حکمتیں دکھائی دیتی ہیں۔

☆ ایک حکمت یہ بھی کہ شریعت مطہرہ درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اپنے اصل کمال کو پہنچی ہے کیونکہ انسانیت بھی مختلف زمانوں میں بچے کی طرح پھلتی پھولتی اور نشوونما پاتی ہے ہر زمانے کے کچھ مختلف حالات ہوتے ہیں جو دوسرے زمانے کے اصول سے کچھ مختلف ہوتے ہیں جیسے بچے کی زندگی شروع میں بہت سادہ ہوتی ہے اس پر کمزوری، جہالت کا غلبہ ہوتا ہے، عقل کی کمی، نادانی کا عالم ہوتا ہے پھر یہ بچہ آہستہ آہستہ

بڑھتا رہا، جوانی کے آثار طاری ہو گئے عقل و فکر کے زیور سے آراستہ ہو گیا ایسے ہی انسانیت کے دور کو سمجھ لیا جائے۔ انسانیت پر بھی یہی کیفیتیں تقاضا کرتی رہیں کہ اس پر شریعت کے مختلف دور طاری ہوں۔

☆ دوسری حکمت یہ بھی دکھائی دیتی ہے کہ طبیب جب کسی مریض کا علاج کرتا ہے تو اسے شروع میں نرم غذا کھانے کا عادی کرتا ہے پھر جب اس کے معدے میں غذا ہضم کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے تو سخت اور طاقتور غذا دے دیتا ہے۔ حکیم مطلق رب قدوس جل مجدہ نے بھی اپنے بندوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے کیلئے شروع میں نرم احکام جاری فرمائے جب وہ ان کے عادی ہو گئے تو دوسرا حکم نازل فرمایا۔

☆ تیسری حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ احکام شریعت میں جو حکمت موجود ہے وہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے، کبھی کسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی صورت میں۔ حکمت کی ان مختلف صورتوں پر احکام بدل جاتے ہیں۔

☆ چوتھی حکمت یہ بھی ہے کہ ایک نبی کی بعثت کے وقت جو رسم و رواج ہوتے ہیں وہ اس قوم میں موجود نہیں ہوتے، اس لئے ان حالات کی رعایت سے کچھ احکام صادر ہوتے ہیں۔

☆ پانچویں حکمت بہت زیادہ واضح دکھائی دیتی ہے کہ لوگوں کو نرم حکم سے سخت حکم کی طرف مائل ہونا گراں گزرتا ہے اس لئے پہلے انہیں ہلکا پھلکا حکم دیا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ سخت احکام کے برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو جائے اسی بناء پر بعض احکام میں نسخ ہو جاتا ہے۔ بچے کو پہلے دودھ، پھر نرم غذا، پھر سخت غذا دی جاتی ہے کہ اس کے پروان چڑھنے میں ان امور کا خیال رکھنا بڑا ضروری ہے اگر آغاز سے ہی اسے سخت غذا دی جائے تو بیماری ہی بیماری ہے۔ بعض اوقات یہ حکمت بھی ہوتی ہے کہ کسی حکم کو منسوخ کر کے ایمانداروں اور کافروں میں امتیاز کر دیا جائے جیسے بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو منسوخ کر کے بیت اللہ شریف کو قبلہ بنایا گیا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

یہود و نصاریٰ کا اعتراض

ناسخ و منسوخ کے اس مسئلہ پر سب سے زیادہ اعتراض یہود و نصاریٰ نے کیا کہ قرآن کریم کے اندر نسخ و منسوخ کا ہونا اس کے غیر الہامی ہونے کی دلیل ہے کہ خدا کے فیصلوں میں ایسا ہونا خدا کی کمزوری ہے۔ (معاذ اللہ)

کاش وہ اپنی کتب (تورات، بائبل) پر نگاہ کرتے تو ایسا نہ کہتے مثلاً تورات سفر اول میں ہے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے کشتی سے اترتے وقت فرمایا ”میں نے تمہارے لئے اور تمہاری اولاد کے لئے تمام جانور حلال کر دیے، صرف خون حرام ہے اسے نہ کھانا“ مگر تورات سفر ثالث میں وضاحت ہے کہ نوح علیہ السلام کے بعد بہت سے چوپائے حرام کر دیئے گئے، یہی نسخ و منسوخ ہے۔

جیسے ہفتہ کے دن کاروبار جائز تھا لیکن یہود کے لئے حرام کر دیا گیا جس کا وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں یہی نسخ ہے۔ یا جیسے یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں ایک شخص دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھ سکتا تھا مگر یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نہ رہا اور دو بہنوں کو ایک شخص کا اپنے نکاح میں رکھنا حرام کر دیا گیا یہی نسخ ہے۔ یا جیسے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں طلاق دینا جائز تھا مگر عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اسے حرام قرار دیا گیا، سورۃ آل عمران شریف میں قرآن مقدس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں اس طرح ارشاد فرمایا

”واحل لكم بعض الذی حرم علیکم“

”میں تمہارے لئے کچھ حرام چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں“

یہی نسخ ہے۔ (علم القرآن ص ۱۵۵ ج ۱)

عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اور شریعت اس کا کلام ہے۔ حکم ہے۔ جب کوئی نبی اپنی تحریر اپنے فیصلے میں تبدیلی کر سکتا ہے تو وہ تو قادر مطلق ہے، احکم الحاکمین ہے اس کے

اس طرح کرنے پر اعتراض کیوں؟ اپنے بندوں کو جس چیز کا چاہے حکم دے جس سے چاہے روک دے، جس حکم کو چاہے منسوخ کر دے اور یہ بات بھی کس قدر واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ فلاں وقت بندوں کو فلاں حکم دینے میں مصلحت ہے، اس وجہ سے وہ حکم دے دیتا ہے اس کو یہ بھی علم ہے کہ فلاں وقت بندوں کے لئے یہ حکم مفید نہ رہے گا اس کو ممنوع قرار دے دیتا ہے مثلاً رمضان شریف کا چاند نظر آتے ہی حکم ہے روزہ رکھو، شوال کا چاند نظر آتے ہی حکم ہے روزہ نہ رکھو تو جس طرح پہلا حکم جائز ہے دوسرا بھی جائز ہے اعتراض کا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

حروف مقطعات

یہ حروف بھی تشابہات قرآن حکیم کی ایک قسم ہے۔ قرآن مقدس کی کئی سورتوں کے آغاز میں حروف آتے ہیں۔ جیسے الم، المص، الر، کھیعص، طه، طسم، طس، یسین، ص، حم، عسق، ق، ن۔ ان کے معانی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کچھ علماء حضرات نے ان کے معانی کئے ہیں جسے تاویل کہا جاسکتا ہے۔ الم کا تاویلی معنی یہ کیا گیا ہے ”الف سے مراد انا ہے، ل سے مراد اللہ ہے، میم سے مراد اعلم ہے۔ معنی یہ ہوگا انا اللہ اعلم (میں اللہ بہت جانتا ہوں)

یہ معنی بھی کیا گیا ہے الف سے مراد اللہ ہے، ل سے مراد جبریل ہے م سے مراد محمد ﷺ ہیں (یہ کلام اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ پر اتارا۔ المص کا وہی معنی انا اللہ اعلم۔ ص سے مراد حضور ﷺ کا صادق ہونا ہے۔ الر الف لام کا معنی وہی ہوگا، را سے مراد پروردگار۔ کھیعص سے مراد کریم، ہادی، جی، علیم، صادق ہے۔ طه سے مراد حضور ﷺ کا ظاہر ہونا اور ہادی ہونا مراد ہے۔ طسم اس کا تاویلی معنی یہ کیا گیا ہے، اس سے مراد وہ پیش گوئی ہے جو طور سینین پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی۔ عسق سے مراد علیم سمیع اور قدیر ہے۔ ق سے مراد قادر ہے۔ ن سے مراد نور ہدایت

ہے مگر سارے معانی حتمی اور قطعی نہیں۔ اس ضمن میں فیصلہ کن جو معنی واضح ہوتا ہے جسے بہت سے جلیل القدر مفسرین نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔ ”ہذا سرّ بین اللہ ورسولہ“ یہ حروف مقطعات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ کہ کتاب اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے اپنے رسول پاک ﷺ پر اتاری ہے اور جس ذات والا صفات پر یہ کتاب اتاری گئی ہے اسے اس کتاب کا علم تو ہونا چاہیے کہ اس میں لکھا کیا گیا ہے اگر مکتوب الیہ پر اس کتاب کا مطلب، مفہوم اور راز ہی نہیں کھلتا تو کتاب بھیجنے کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا جب مکتوب الیہ کو پتہ ہی نہیں کہ اس خط میں، کتاب میں ہے کیا تو وہ دوسروں کیا بتا سکے گا؟

ان حروف مقطعات کا یہی معنی کیا جائے تو بہتر ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہے۔ امام بغوی کہتے ہیں جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہر کتاب میں ایک مخفی بھید اور راز ہوتا ہے قرآن مجید میں خدا کا راز حروف مقطعات میں ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ہر کتاب کا خلاصہ ہوتا ہے قرآن مجید کا خلاصہ حروف تہجی ہیں۔ اس روایت کو امام ثعلبی نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ سمرقندی نے حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے، قرطبی نے سفیان ثوری سے۔

حضرت سجاوندی کا ارشاد ہے حروف مقطعات کے بارہ میں صدر اول کے تمام لوگوں کا متفقہ فیصلہ ہے ”انہا سرّ بین اللہ و بین نبیہ ﷺ“ (یہ اللہ اور اس کے نبی ﷺ کے درمیان راز ہے) قرآن مجید کی آیات متشابہ ہوں یا محکم حضور ﷺ پر ان کا بیان فرمانا لازم و ضروری ہے۔ قرآن مقدس کا ارشاد ہے۔

”لتبینہ للناس“

ہم نے قرآن نازل کیا کہ تو لوگوں کو واضح کرے۔

اگر ان حروف کا حضور ﷺ کو علم نہ دیا گیا ہو تو وضاحت کیسے ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان حروف کا

علم حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے بلکہ آپ کے وسیلہ سے امت کے کالمین کو بھی بتایا گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں راسخین فی العلم میں سے ہوں جو لوگ متشابہات اور مقطعات کی تفسیر کے عالم ہیں ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ مجد الف ثانی علیہ الرحمہ نے خود فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قرآنی مقطعات اور اس کے اسرار کی تاویل ظاہر کی ہے۔ (تفسیر مظہری۔ الم حصہ اول)

بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں جیسے ابن جریر، ابن المذہب، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ۔ یہ کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور اس کی سند کو صحیح بتایا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

بعض مشکل مقامات

قرآن مقدس کی تفسیر و تشریح کے مطالعہ میں بعض مقامات پر صفات باری تعالیٰ کا ذکر بھی اس طرح آتا ہے کہ عقل مشکل میں پھنس جاتی ہے اس ضمن میں چند ایک مشکل مقامات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس علم تفسیر کے طالب علم کے لئے کسی حد تک سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ ان مشکلات میں ایک آیہ کریمہ ”ثم استوی علی العرش“ بھی ہے اس کے ترجمہ میں بعض لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہوا جلوہ گر ہوا۔ عرش پر متمکن ہونا اس کی شان ربوبیت کے منافی ہے کہ وہ مکان و زمان کی قیود و حدود سے پاک ہے۔ یہاں پر استوی کا معنی غالب آیا، کر لیا جائے تو مضائقہ نہیں کہ وہ تمام امور پر غالب ہے۔ اگر یہاں پر استوی کا معنی علا (بلند و بالا) کر لیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں کہ وہ ہر شئی، ہر مقام، ہر عظمت، ہر بلندی سے بلند و بالا ہے۔ بشرطیکہ اس بلند و بالا کے معنی کو سمت و جہت سے منزہ مانا جائے۔ ”ثم استوی علی العرش“ کا معنی یہ کر لیا جائے کہ وہ عرش کے پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوا تو بھی اس مشکل سے نکلا جاسکتا ہے۔ ”استوی علی العرش“ کا ایک معنی یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ عدل کے

ساتھ قائم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جو استوی کی نسبت ہے وہ اعتدال کے معنی میں ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

لفظ وجہہ کا معنی

قرآن مقدس کی آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی ذات والا صفات کے بارہ میں ایک لفظ ”وجہہ“ بھی آیا ہے۔ جس کا معنی چہرے کا ہے یہاں بھی ذہنی طور پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو منہ، چہرہ سے پاک ہے۔ تو یہ اشکال قرآن مقدس کی متعدد آیات سے بھی حل ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”یریدون وجہہ“ یہاں لفظ وجہہ کا معنی ذات خداوندی ہے کہ اس کے مقبول بندے اس کی ذات کا ارادہ کرتے ہیں۔ دوسری جگہ پر یہ لفظ اس طرح وارد ہے ”انما نطعمکم لوجہ اللہ“ یہاں پر بھی لفظ ذات اور رضا کیلئے استعمال ہوا ہے۔ کہ ہم لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں تو صرف اسکی ذات اور اس کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں اس کا رخیر میں کوئی دوسرا مقصد نہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

لفظ ”نفس“ کا معنی

قرآن مقدس کے اندر اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی صفات کے بارہ میں ایک لفظ نفس بھی وارد ہے جس سے ذہن میں اشکال پیدا ہوتا ہے۔ اس اشکال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ”نعلم ما نفسی ولا اعلم ما فی نفسک“ تو جانتا ہے جو کچھ میرے علم میں ہے اور مجھے پتہ نہیں جو کچھ تیرے علم غیب میں ہے۔ یہاں پر نفس سے مراد علم غیب لے لیا جائے تو اشکال ختم ہو جاتا ہے کہ غیب بھی نفس کی طرح پوشیدہ ہی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر بھی یہ لفظ وارد ہے ”یحذرکم اللہ نفسہ“ یہاں پر نفس کے معنی عذاب الہی کے کر لئے جائیں تو اشکال ختم ہو

جاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

لفظ ”ید“ کا معنی

قرآن مقدس میں کئی مقامات پر یہ لفظ وارد ہوا ہے جس سے طالب علم کو بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ ”ید“ کا معنی تو ہاتھ ہے اور اللہ تعالیٰ ہاتھوں سے پاک ہے ”مما خلقت بیدی“ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ دوسری جگہ پر اس طرح وارد ہے ”ید اللہ فوق ایدیہم“ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، تیسری جگہ اس طرح وارد ہے ”ان الفضل بید اللہ“ بے شک فضل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، یہ آیات مبارکہ بھی تشابہات کی قسم سے ہی ہیں، ان مقامات پر ان کی تاویل قدرت سے ہی کی گئی ہے۔

امام سہیلی کہتے ہیں ید سے بھی دراصل بصور کی طرح موصوف کی صفت مراد ہے اس لئے رب قدوس کے اس ارشاد ”اولی الایدی والابصار“ میں جن لوگوں کی مدح فرمائی ہے ان کی مدح میں ایدی کو لفظ ابصار کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔ علامہ اشعری کہتے ہیں صفت ید کو صفت قدرت کے معنی سے قرب حاصل ہے، ید اور قدرت کے معنی قریب قریب ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

لفظ ”ساق“ کا معنی

قرآن مقدس کے بعض مشکل مقامات میں سے ایک لفظ ”ساق“ بھی ہے، قرآن مقدس میں اس طرح وارد ہے۔ ”یوم یکشف عن ساق“ جس دن پنڈلی کھولی جائے گی۔ تو یہاں بھی لفظ ساق صفات تشابہات سے ہے۔ اس سے ہدایت قیامت کی طرف اشارہ ہے جیسے عرب کہتے ہیں ”قامت الحروب علی ساق“ جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی یعنی شدت اختیار کر گئی۔

حاکم نے مستدرک میں عکرمہ کے طریق پر ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اُن سے اس بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں یہی مصرعہ پڑھا ”وقامت الحرب علی ساق“۔ یا جیسے قرآن مقدس میں ارشاد ہوتا ہے ”فانی قریب“ بیشک میں قریب ہوں، بظاہر تو قرب اور بعد کا تعلق دوری اور نزدیکی کے معنی کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ جسمانی طور پر قریب ہے، جبکہ وہ ذات بابرکات جسم و جسمانیات سے پاک ہے، اس ارشاد میں قرب بطور صفت وارد ہے، معنی یوں ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ بندوں کے قریب ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وحی الہی کی پہلی ضرورت

انسان کی تکمیل جسم اور روح دونوں سے مل کر ہوتی ہے، ان دونوں کے صحیح تعلق کا نام ہی صحیح حیات ہے جسم کی خوراک کیلئے رب قدوس جل مجدہ نے زمین سے ہی بہت کچھ پیدا فرمادیا کہ جسم کا تعلق بھی زمین سے ہی ہے۔ خوراک، لباس، علاج وغیرہ تمام ضروریات زمین سے ہی پوری ہوتی ہیں اور روح اس عالم کی شئی ہی نہیں، اس کا تعلق عالم بالا سے ہے، گویا روح اور جسم دونوں کے ملک الگ الگ ہیں اور ہر ملک کی غذا بھی الگ الگ ہی ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش میں بسنے والوں کی غذا پاکستان سے مختلف ہے، افریقہ کے باسی لوگ اپنے انداز کا کھانا تیار کرتے ہیں جو وہی کھا سکتے ہیں ہم پاکستانی مدینہ منورہ پہنچ کر بھی پاکستانی ہوٹل تلاش کرتے ہیں کہ وہ اپنی ملکی غذا سے ہی وابستہ ہیں۔ میری جسمانی غذا سے میری روح کو کوئی فائدہ نہیں کہ وہ یہ خوراک کھائے گی ہی نہیں وہ تو چاہتی ہے اُسے اس کے ملک کی غذا ملے۔

چنانچہ رب قدوس جل مجدہ نے جو سارے جہانوں کا رب ہے اس روح کی غذا کا سامان بذریعہ وحی فرمایا جو قرآن مقدس کی شکل میں ہم تک پہنچا، اس مقدس وحی کے پڑھنے، سننے، عمل کرنے سے اسے سکون ملتا ہے کہ اُسے اُس کے ملک کا خطر مل گیا ہے۔

وحی الہی کی دوسری ضرورت

وحی الہی کیلئے میری ایک محتاجی اور بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل، فکر، دل، دماغ سے مزین کر کے روانہ فرمایا اور ”ولقد کرمنا بنی آدم“ کا تاج پہنا کر بھیجا گیا، اب ضروری تھا کہ اُسے اپنے وقار کو برقرار رکھنے اور اپنے اس عظیم مقام کا تحفظ کرنے، اپنے بدترین دشمن شیطان سے بچنے کیلئے اُسے کوئی ضابطہ دیا جائے جس سے حق و باطل، اچھائی و برائی کا امتیاز کر سکے وہ ضابطہ وحی الہی ہے، جو انسان کے ہر مرحلہ پر رہنمائی کرتا ہے اگر کسی مقام پر وحی الہی سے لاپرواہی کرے گا تو سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا انسان کو سیدھی راہ پر قائم رکھنے اور اپنے عزت و وقار کو بچانے کیلئے ضروری تھا کہ اسے یہ ضابطہ وحی الہی دیا جائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وحی الہی کی تیسری ضرورت

رب قدوس جل مجدہ نے انسانی فطرت کے اندر چار چیزیں ودیعت رکھی ہیں جن کی احتیاج ہر وقت انسان کو رہتی ہے۔ ان ضروریات زندگی کے بغیر زندگی بے معنی قرار پاتی ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں کھانا، پینا، نکاح اور ذوق و شوق۔ جیسے پہلی تین چیزیں کھانا، پینا، نکاح ہمیشہ اور ہر دور میں رہا اسی طرح چوتھی شی ذوق یا تلاش محبوب بھی ہمیشہ اور ہر زمانہ میں رہا۔ تمام لوگوں کی تمام عبادت گاہیں اسی کا مظہر ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ بندہ کس دین سے تعلق رکھتا ہے؟ مگر اس میں جستجو موجود ہے۔ لوگوں میں وہ جستجو غلط راہ اختیار کر گئی، کسی نے سورج چاند کی عبادت میں ذوق پایا، کسی نے پتھروں اور درختوں کو پوجنے میں کامیابی دیکھی، کسی نے بعض جانوروں کی پرستش میں سکون محسوس کیا یہ سب کچھ باطل پرستی تھی، ضروری تھا کہ میری روح کے سکون کیلئے ایسا انتظام ہو جو ظن، تخمینہ، اٹکل، اندازے سے پاک ہو وہ نظام، نظام وحی الہی ہے جس میں تغیر و تبدل، بے کاری، فرسودگی کا تصور بھی نہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وحی الہی کی چوتھی ضرورت

کائنات کے اندر دو چیزیں پائی جاتی ہیں پہلی حیات، دوسری معقولات انسان کو دونوں کی ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً حیات کے اندر کسی شے کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے، آنکھ کا نور بھی اور سورج بھی۔ دونوں میں کوئی ایک نہ ہو تو شے کا دیکھنا مشکل ہو جائے گا اسی طرح معقولات کے اندر بھی دو نوروں کا ہونا ضروری ہے ایک نور داخلی جسے عقل کہہ لیں دوسرا نور خارجی ہے جو وحی الہی ہے اگر دونوں میں سے ایک نہ ہو تو نظام معطل ہو گا ضروری تھا کہ وحی نازل ہو تاکہ نور عقل کی راہنمائی کر سکے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وحی الہی کی پانچویں ضرورت

جس طرح اس عالم کثیف میں بعض چیزیں نقصان دہ ہیں اور بعض نفع بخش اسی طرح عالم لطیف میں بھی بعض چیزیں نقصان دہ ہیں اور بعض نفع بخش ہیں۔ کفر نقصان دہ ہے، اندھیرا ہے اور موت ہے۔ ایمان نفع بخش ہے، نور ہے اور حیات ہے، ایمان کی ضرورت تھی۔ یہ بھی ضروری تھا کہ ایمان کا تعلق بھی عالم لطیف سے ہی ہو، لہذا وحی کی شدید ضرورت تھی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

پہلی وحی اور غار حرا

حضور سید عالم ﷺ کی عمر مبارک چالیس برس کو پہنچنے سے قبل آپ پر رویاء صادقہ کا زمانہ رہا جو کچھ رات کو خواب دیکھتے وہ صبح کی مانند سچا ہوتا۔ دور جاہلیت کی اندھیری رات زمانہ نبوت کے آغاز کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ عمر مبارک 40 سال کو پہنچی تو 17 رمضان المبارک کو غار حرا میں فرشتہ حاضر ہوا، سلام کیا فرشتے کے اس حال میں آنے کا ذکر زرقانی ص 211 میں ہے۔ چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہونے کے ذکر کو

ابن عباس، انس بن مالک، جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم سے صحیح بخاری شریف میں مذکور ہے ڈاکٹر اقبال مرحوم نے غار کے اندر قیام کو اچھے محبت بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید مدتے جزویشن کس رانید

حضور ﷺ نے غار حرا میں تنہائی پسند فرمائی اس دوران آپ کسی سے نہ ملتے

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

غار حرا کے انتخاب کی حکمتیں

یہ سوال خواہ مخواہ ذہن میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی عبادت اور ریاضت کے لئے غار حرا کا انتخاب کیوں فرمایا جب کہ اس سے قریب بھی ایسے کئی غار تھے۔ علامہ ازرقی نے تاریخ مکہ (مطبوعہ مصر) میں چند حکمتیں بیان کی ہیں۔

پہلی حکمت: پہلی حکمت یہ بیان کی ہے کہ یہ غار بلندی پر تھا یہاں لوگوں سے میل جول میں زیادہ محفوظ رہا جاسکتا تھا۔

دوسری حکمت: دوسری حکمت یہ بیان کی ہے کہ غار حرا سے کعبہ شریف کی زیارت ہو جاتی تھی۔

تیسری حکمت: تیسری حکمت یہ فرمائی کہ یہ غار مشرق کی سمت میں تھا، کہ مادی آفتاب بھی مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے بھی مشرقی سمت کے پہاڑ کو منتخب فرمایا کہ روحانی آفتاب بھی مشرق سے ہی طلوع ہو کہ لوگوں کو پتہ چل جائے۔ جیسے مادی آفتاب سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں روحانی آفتاب سے اس سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور دونوں سورجوں کے طلوع ہونے میں موافقت ہو جائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ اللہ سے پناہ مانگتا ہوں نکالے ہوئے

شیطان سے ﴿۱﴾

تفسیر

﴿۱﴾ انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے چونکہ یہ دشمن بڑا ہے اس لئے اس سے پناہ بھی اس ذات سے مانگی جا رہی ہے جو سب سے بڑی ہے۔ اولیاء، انبیاء کی ذوات قدسیہ نے مختلف مقامات پر انہیں الفاظ سے ملتے جلتے انداز میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی ہے، حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے جب حضرت جبریل علیہ السلام کو انسانی شکل میں دیکھا تو فرمایا ”انی اعوذ بالرحمن منک“ بے شک میں رحمان کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔ سیدنا نوح علیہ السلام بارگاہ قدس میں عرض کرتے ہیں ”انی اعوذ بک ان اسئالک ما لیس لی بہ علم“ (اے اللہ) تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تجھ سے ایسا سوال کروں جس کا مجھے علم نہ ہو۔

قرآن مقدس کے ایک اور مقام پر حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی والدہ کا اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی ولادت پر عرض کی

انی اعیذھا بک وذریئھا من الشیطان الرجیم (القرآن)

(اے اللہ) بے شک میں پناہ مانگتی ہوں اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے مردود شیطان سے قرآن مقدس کی آخری دونوں سورتوں کے آغاز میں رب سے پناہ مانگنے کا ذکر موجود ہے۔ احادیث مبارکہ میں ”اعوذ باللہ“ کے متعلق متعدد روایات ملتی ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں استعاذہ (اعوذ) پڑھنے کے بارہ میں باقاعدہ ایک باب ہے جس میں اس کی فضیلت اس طرح درج ہے۔ جو شخص صبح و شام یہ کلمات پڑھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ وہ ہر قسم کے زہر سے محفوظ رہے گا وہ کلمات طیبات یہ ہیں ”اعوذ

بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق۔ مشکوٰۃ شریف کے اسی مقام پر ہے حضور ﷺ خود یہ پڑھا کرتے تھے ”اللهم انی اعوذ بک من الهم والحزن والعجز والكسل والجبن والبخل وغلبة الرجال“ اے اللہ بے شک میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں پریشانی سے، غم سے، سستی سے، بزدلی سے، بخل سے، لوگوں (دشمنوں) کے غالب آجانے سے۔

بستان التفاسیر میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص روزانہ دس مرتبہ (تعوذ) ”اعوذ باللہ من الشطن الرجیم“ پڑھ لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ پیدا کر دیتا ہے یا مقرر فرما دیتا ہے جو شیطان کے مکر و فریب سے اُسے بچائے رکھتا ہے۔

بستان التفاسیر بحوالہ تفسیر نعیمی ص 22 ج 1، روح البیان شریف میں ”اعوذ باللہ“ کی تفسیر میں درج ہے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو غلو ص دل سے اعوذ باللہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے حائل کر دیتا ہے۔ قرآن مقدس کی تلاوت سے پہلے ”اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم“ پڑھنے کا حکم اس طرح ملتا ہے

”فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ“

جب تو تلاوت کرے تو اعوذ باللہ پڑھ

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم

والا ہے ﴿۲﴾

تفسیر

﴿۲﴾ بسم اللہ شریف کے فضائل میں بہت سی روایات ہیں حدیث شریف میں ارشاد ہے ”کل امر ذی بال لم یبدأ بہ بسم اللہ فهو ابتر او کما قال ﷺ“ جس کام کے شروع میں بسم اللہ شریف نہ پڑھی جائے وہ بے برکت ہو جاتا ہے اور اس میں شیطان شریک ہوتا ہے۔ اگر یہ کام بسم اللہ شریف پڑھ کر شروع کیا گیا ہے تو وہ شیطان کی شمولیت اور اس کے اثرات سے پاک رہتا ہے۔

تفسیر کبیر میں بسم اللہ شریف کی تفسیر میں ایک روایت درج ہے۔ فرعون نے اپنے ایک مکان کے دروازہ پر بسم اللہ شریف لکھوائی ہوئی تھی اس نے یہ کام اس وقت کیا تھا جب اس نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور خدا کا باغی و سرکش نہیں تھا جب اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور اپنے رب کا باغی ہوا تو اللہ کے جلیل القدر نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جو اس نے قبول نہ کی تو آپ نے اس کے حق میں بددعا کی وحی آئی اے کلیم! ہے تو یہ اسی لائق کہ اسے برباد کیا جائے مگر جس مکان میں رہ رہا ہے اس کے ایک دروازہ پر بسم اللہ لکھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ عذاب الہی سے بچا ہوا ہے غالباً یہی وجہ ہے جب اس پر خدا کا غضب نازل ہوا تو یہ اس مکان سے باہر تھا دریا میں ڈبو دیا گیا۔

تفسیر قرطبی میں بسم اللہ شریف کے فضائل میں حضور سید عالم ﷺ کا ارشاد نقل ہے ”اغلق

بابک و اذکر اسم اللہ و اطغی مصباحک و اذکر اسم اللہ و خمر اناک و اذکر اسم اللہ“ دروازہ بند کرو، دیا بجھاؤ، برتن ڈھانپو، تو اللہ کا نام لیا کرو یعنی ہر چھوٹے بڑے کام کو بسم اللہ سے شروع کرو برکت ہوگی۔ مشکلات حل ہوں گی، خدا کا فضل و کرم ساتھ رہے گا، رحمت ربانی تیرے کام میں

شریک ہوگی، ایک موقع پر عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے دربار رسالت میں شکایت عرض کی حضور جسم میں درد رہتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا جہاں پر درد ہو وہاں ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ شریف پڑھو اور سات مرتبہ یہ الفاظ کہو ”اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما جدد واحاذر“ اللہ تعالیٰ کی عزت وقدرت سے ہر اس دکھ سے پناہ مانگتا ہوں جو پاتا ہوں۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو خط لکھا جس کے الفاظ قرآن کریم نے یوں بیان فرمائے۔ ”انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم“ حضور ﷺ نے ہر قل کو خط لکھا تو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع فرمایا حضور ﷺ اور قریش کے درمیان جو صلح حدیبیہ کے نام سے معاہدہ ہوا اس تحریر کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی گئی۔

(بخاری شریف ج 1 ص 379)

سیدنا نوح علیہ السلام نے کشتی پر سوار ہوتے پڑھا تھا ”بسم اللہ معجروہا ومرسلہا ان ربی لغفور الرحیم“، روم کے بادشاہ ہرقل نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ اُسے سر میں درد رہتا ہے آپ نے اسے ایک ٹوپی بھجوائی جب پہن لیتا تھا درد ختم ہو جاتا جب اتار دیتا درد شروع ہو جاتا اس نے حیرت و تعجب سے ٹوپی کھلوائی تو اس میں ایک کاغذ رکھا تھا جس پر لکھا تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اگر آج میرے بسم اللہ شریف پڑھنے سے مجھے خود یا کسی کو فائدہ نہیں ہوتا تو یہ صورت میری زبان، میرے کردار کے باعث ہی ہو سکتی ہے ورنہ بسم اللہ شریف کی برکتوں میں تو کمی نہیں۔ نسخہ تو صحیح ہے، مکمل ہے مگر مجھ سے استعمال میں کوتاہی ہو رہی ہے کہ اچھا صاف ستھرا برتن استعمال نہیں ہو رہا۔ رب قدوس جل مجدہ کے اسماء حسنیٰ میں اسم پاک ”اللہ“ ذاتی نام ہے باقی سارے کے سارے اسماء حسنیٰ صفاتی ہیں یہ وہ اسم گرامی ہے جس کے ذکر سے بندہ کفر سے اسلام میں آجاتا ہے اگر کلمہ شریف میں لا الہ الا اللہ کے بجائے الا الرحمن، الا الرحیم یا کوئی دوسرا اسم گرامی ذکر کرے تو مومن نہیں ہو سکے گا اسی طرح حضور ﷺ کا ذاتی اسم پاک محمد (ﷺ) ہے۔ اگر کوئی شخص کلمہ شریف میں اسم پاک محمد ﷺ کی بجائے کوئی دوسرا نام ذکر

کرے تو رسالت کا اقرار نہ ہو سکے گا اُلُوہیت کے اقرار کے لئے اسم پاک ”اللہ“ اور رسالت کے اقرار کے لئے اسم پاک ”محمد“ خاص ہیں اگر یہ اسم پاک اللہ ”لاہ“ سے لیا جائے تو اس کا معنی بلندی کا ہے کہ وہ سب سے بلند ہے، عظیم ہے، سب سے اکبر ہے، سب سے بلند ہے۔ ”لاہ“ کا معنی حجاب کا بھی آتا ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ وہ ذات بابرکات عقل و فکر، وہم و گمان سب سے ورا ہے اگر یہ ”الہ“ سے لیا جائے تو اس کا معنی عاجزی کا بھی ہے کہ پوری کائنات اس کے حضور عاجز ہے، الہ کا ایک معنی پریشانی کا بھی ہے تو معنی یہ ہوگا کائنات کا کوئی بھی فرد جب پریشان ہو، دکھ میں مبتلا ہو، رنج و غم اور مصائب گھیر لیں تو پھر اس کا آخری سہارا وہی ذات گرامی اللہ ہی ہے اور اسی کے حضور پناہ لیتا ہے، معافی چاہتا ہے اسی پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہی کارساز حقیقی ہے (لسان العرب ج 4 ص 470، قاموس ج 4 ص 416) علامہ زبیدی فرماتے ہیں لفظ اللہ ذات واجب الوجود کے لئے نام ہے اور یہ کسی لفظ سے بھی مشتق نہیں۔

”الرحمن الرحیم“ ان دونوں ناموں میں مبالغہ ہے یعنی بے حد رحم کرنے والا، ہر لمحہ رحم کرنے والا اس کی رحمت سے مراد بندے پر ہر نعمت، ہر فضل، ہر کرم کا انعام ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے ہماری گستاخیوں نااہلیوں اور بغاوت کے باوجود وہ رحم فرماتا ہے، بندے کی حالت یہ ہے اگر کسی پر مہربان ہوتا ہے اور پھر وہ بندہ کسی مرحلہ پر اسی کا نافرمان بن جاتا ہے تو فوراً اس سے اپنے تعلقات توڑ لیتا ہے، اسے اپنے پیار سے محروم کر دیتا ہے انعامات بند کر دیتا ہے مگر اللہ وہ رحمن و رحیم ہے اپنے سرکش، گستاخ، باغی، منکر پر بھی رحمت کا دروازہ بند نہیں کرتا اس کا رزق بند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کی ان صفات مقدسہ کا اطلاق کسی دوسرے پر ہو سکتا ہی نہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فضائل الفاتحہ

یہ سورۃ شریف مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اس لئے مکی کہلائی اس کی سات آیات میں بے شمار فضائل سے چند ایک ہدیہ ناظرین ہیں۔ اس سورۃ شریف کے کئی نام ہیں الفاتحہ، فاتحۃ الكتاب، أم القرآن، السبع المثانی، أم الكتاب، الشفاء، الوافیہ، الکافیہ، علامہ آلوسی علیہ الرحمہ نے اس سورۃ شریف کے نام 22 سے زائد بتائے ہیں ان میں فاتحہ القرآن، تعلیم المسئلہ، سورۃ السوال، سورۃ المناجات، سورۃ التفویض، سورۃ النور، بھی ہیں۔

حضرت ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے مجھے فرمایا تمہیں مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی ایک عظیم سورت پڑھاؤں گا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلے میں نے عرض کی حضور آپ نے فرمایا تھا تجھے ایک عظیم سورۃ کی تعلیم دوں گا تو جواب میں آپ نے فرمایا الحمد للہ رب العلمین یہ سبع مثانی ہے اور وہ قرآن حکیم ہے جو مجھے دیا گیا۔ (بخاری شریف ج 2 ص 749)

اس سورۃ شریف کی عظمت و فضیلت میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ملتی ہے جسے امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں نقل کیا ہے۔ ہم کسی سفر میں تھے ہمیں ایک لڑکی نے آکر کہا ہمارے قبیلہ کے سردار کو بچھو نے ڈس لیا ہے کیا تم میں سے کوئی شخص دم کر سکتا ہے؟ ہم میں سے ایک شخص اس کے ساتھ گیا اس نے دم کیا وہ مریض شفا یاب ہو گیا۔ اس سردار نے اسے بیس بکریاں دینے کا حکم دیا جب وہ واپس آیا تو ہم نے اس سے پوچھا کہ تم پہلے بھی دم کرتے تھے تو اس نے کہا میں نے تو صرف ام الکتاب (سورۃ الفاتحہ) پڑھ کر دم کیا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر ہم نے یہ معاملہ دربار رسالت ﷺ میں عرض کیا حضور ﷺ نے فرمایا اسے کیا خبر یہ دم ہے ان بکریوں کو تقسیم کرو (پھر مسکراتے ہوئے فرمایا) میرا حصہ بھی نکالو۔ بخاری شریف (ج 2 ص 479)

اگر آج سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کرنے سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا تو یوں کہو کہ گولی تو صحیح ہے مگر

بندوق کی نالی خراب ہونے کی وجہ سے نشانے پر نہیں لگتی۔

اسی مقدس سورۃ کی فضیلت میں امام ترمذی نے اپنی صحیح ترمذی شریف میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے حضور ﷺ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کیا تم پسند کرتے ہو تمہیں ایسی سورت کی تعلیم دوں جس کی مثل توراۃ، انجیل، زبور میں نہیں حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور ارشاد فرمائیں حضور ﷺ نے فرمایا تم نماز کس طرح پڑھتے ہو تو انہوں نے فاتحہ شریف پڑھی، حضور ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کی مثل توراۃ، انجیل، زبور میں نہیں (ترمذی شریف ص 408)

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ الرَّحْمَنِ
الرَّحِيمِ يَا لَيْلِ يَوْمِ الدِّينِ

تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو سارے جہانوں
کا رب ہے ﴿۳﴾۔ نہایت رحم فرمانے والا
بہت مہربان ہے۔ ﴿۴﴾ جزا کے دن کا
مالک ہے۔ ﴿۵﴾

تفسیر

﴿۳﴾ لفظ حمد کا معنی عربی میں اچھی تعریف کا ہے کسی کی اچھی صفات کا ذکر کرنا، اگر کسی کی بری صفات کا ذکر ہو تو یہ حمد نہیں جن علماء نے الحمد پر الف لام کو استغراقی کہا ہے اس کا معنی یہ ہوگا کہ حمد میں جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ سب اللہ کے لئے ہے اس لئے کہ تمام خوبیاں تمام کمالات، رعنائیاں جو کچھ ہے، سب کچھ اسی سے ہے۔ کائنات بھر میں جس شئی کی تعریف ہوگی وہ دراصل رب کی ہی تعریف ہوگی کہ جس نے اس شئی کو بنایا اسے عقل و فکر سمجھ تو اللہ نے ہی دی، مکان کی تعریف کا ریگر کی ہے اور کار ریگر کو یہ خوبی، یہ کمال اللہ نے ہی دیا تو دراصل تعریف اللہ کی ہی ہوئی۔

اس سورۃ کا آغاز حمد سے کیا گیا ہے کہ خدا کو جاننے اور پہچاننے میں انسان کا پہلا کام یہی ہے کہ وہ اس کی کائنات میں غور و فکر سے کام لے اگر یہ بندہ اس کی کمال قدرت پر نگاہ کرے گا تو واضح محسوس کر لے گا کہ اللہ کے رب ہونے اور رحمان و رحیم ہونے کا جلوہ ہر شئی میں نمایاں اور کھلا دکھائی دے گا تو بے ساختہ کہہ اٹھے گا ”الحمد لله رب العالمین“ زبان سے تعریف ہوگی تو حمد قولی کہلائے گی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کوئی کام کرے گا تو حمد فعلی ہوگی۔ روح اور دل کے اعتبار سے تعریف ہوگی تو حمد حالی کہلائے گی۔ یا اسے یوں سمجھ لیا جائے کہ تعریف ہوتی ہے کسی کے حسن کی، کسی کے کمال کی، کسی کی خوبیوں کی اور یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ تمام خوبیوں، تمام کمالات کا مبداء اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ ہے تو

واضح ہوا کہ تمام تعریفوں کا مستحق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ تمام تعریفوں کا مالک اللہ ہی ہے کہ ہر چیز ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، چاند، تارے، سورج، جن، فرشتہ اور بتوں کی پرستش کرنے والے اگر اس معنی پر غور کر لیں تو ان پر ان کا باطل عقیدہ واضح ہو جائے گا کہ مخلوق میں جن خوبیوں کو دیکھ کر وہ ان کے لئے سر بسجود ہو گئے وہ خوبیاں وہ کمالات وہ رعنائیاں ان کی اپنی تو ہیں ہی نہیں، وہ انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں اس غور کے بعد یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے گی کہ عبادت کے لائق صرف اور صرف اللہ ہی ہے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء میں پوری کائنات بہت پیچھے ہے اور حضور ﷺ بہت آگے ہیں سمندروں کے قطروں، درختوں کے پتوں ریت کے ذروں نے جس قدر اللہ تعالیٰ کی حمد کی ہے وہ سب تھوڑی ہے اور حضور ﷺ نے جو حمد کی ہے وہ بہت زیادہ ہے مگر اس عظیم کمال کے باوجود حضور ﷺ فرماتے ہیں لا احصى ثناء عليك كما اثنيت على نفسك میں تیری ثنا ایسی نہیں کر سکا جیسی تو نے خود کی ہے اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے کے فضائل میں بہت سی روایات ملتی ہیں امام مسلم نے ابو مالک اشعری سے روایت کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا ”الحمد لله“ میزان کو بھر دیتا ہے اور ”سبحان الله“ اور ”الحمد لله“ زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیتے ہیں۔

(صحیح مسلم شریف ج 1 ص 148)

حمد کے فضائل میں امام ترمذی نے اپنی کتاب ترمذی (ص 166) میں سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا جب کسی کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے تم نے میرے بندے کا بچہ اٹھا لیا وہ کہتے ہیں ہاں پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے اس کے دل کا ٹکڑا اٹھا لیا؟ وہ فرشتے کہتے ہیں ہاں پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں تیری حمد کی اور ”انا لله وانا اليه راجعون“ پڑھا اللہ فرماتا ہے اس بندے کے لئے جنت میں گھر بنا دو اس کا نام ”بیت الحمد“ رکھو۔

(تبیان ص 169)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ کھانے پینے کے بعد پڑھا کرتے تھے الحمد لله الذي اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمين تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں کھلایا پلایا اور مسلمانوں سے بنایا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا جس نے کھانے کے بعد یہ کہا ”اس اللہ کے لئے تمام تعریفیں ہیں جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ (ترمذی شریف)

ربوبیت

رب العالمین کے ارشاد گرامی میں پہلے دعویٰ کی دلیل بیان فرمائی گئی کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے اس لئے ہیں کہ وہ سارے جہانوں کا رب ہے اس سورہ مبارکہ میں اللہ کی پہلی صفت رب العالمین کا ذکر ہے ”ثم لغت نے ربوبیت کے معنی اس طرح کئے ہیں ”هو انشاء الشئ حالاً فحالاً الى حد التمام“ کسی شئی کو درجہ بدرجہ حد تمام تک پہنچانے کو تربیت کہتے ہیں، ربوبیت میں ضروری ہے کہ پرورش کا نظام ایک جاری اور مسلسل ہو کسی وجود کو اس کی تکمیل تک جس قدر ضروریات پیش آئیں ان سب کا انتظام ہوتا رہے۔ ماں کی تربیت میں رب قدوس کی اس صفت کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے جب بچے کا معدہ دودھ کے علاوہ کسی غذا کو برداشت نہ کر سکتا تھا تو اسے دودھ ہی دیا جاتا رہا جب ذرا معدہ طاقت ور ہوا تو تھوڑی بہت ہلکی پھلکی غذا دی جانے لگی ہے، چلنے کی طاقت نہ تھی تو ماں کی گود ہی کام دیتی رہی، کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو ماں کی انگلی کا سہارا مل گیا غرض بچے کے بچپن سے اس کی جوانی تک اسے ہر ضرورت مہیا ہوتی رہی اس مجازی ربوبیت کے مطالعہ سے رب قدوس کی حقیقی ربوبیت تک ذہن لیجانے کا راستہ مل جاتا ہے۔

پوری کائنات کے اندر پوری مخلوقات کے لئے رب قدوس جل مجدہ نے اس کی تربیت کا بہترین نظام مہیا رکھا ہے اور اس کے ترتیب دیئے ہوئے نظام کے تحت پوری کائنات کا نظام چل رہا ہے رب

قدوس جل مجدہ کی ربوبیت کا نظام دو طرح دکھائی دے رہا ہے ایک وہ نظام ہے جو پوری کائنات کے لئے اور سب ہی لوگ اس نظام ربوبیت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں چاند کی روشنی، سورج کی گرمی، ہوا کا چلنا، مینہ کا برسنا، یہ انعامات سبھی کے لئے ہیں کوئی امتیاز نہیں، حاکم کوئی بھی ہو سکتا ہے، رزق کسی کو بھی مل سکتا ہے، صحت و عافیت کسی کے لئے بھی ہو سکتی ہے، اسے ربوبیت عامہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے

ربوبیت کا دوسرا پہلو ایک خاص ہے انبیاء علیہم السلام کا وجود، اولیاء عظام کا انتخاب، روحانیت کے مدارج اور مراتب یہ ربوبیت خاصہ کا پرتو ہے کہ یہ کمالات ہر کس و ناکس کے لئے نہیں۔

عالمین

علامہ اسماعیل حقی علیہ الرحمہ نے اسی مقام پر روح البیان میں فرمایا اٹھارہ ہزار عالم میں زمین و آسمان جو کچھ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں یہ سارا ایک عالم ہے جنات، فرشتے، انسان ملکوت، ناسوت، اجسام، امکان، سفلی، علوی یہ سب عوالم ہیں رب قدوس جل مجدہ ان سب کا رب ہے اور ان تمام عالموں کو ان کی ضروریات کے مطابق چلا رہا ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے چالیس ہزار عالم پیدا کئے مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے جسے مقاتل کہتے ہیں کہ اسی ہزار عالم میں چالیس ہزار خشکی میں، چالیس ہزار سمندر میں۔

ابوالعالیہ سے روایت ہے جن و انس کے عالم میں ان کے علاوہ زمین کے چار زاویے ہیں ہر زاویے میں ایک ہزار پانچ سو عالم ہیں عالم جتنے بھی ہیں ہزاروں میں یا لاکھوں میں، حضور ﷺ کی عظمت کے ایک پہلو پر نظر دوڑائیں حضور ﷺ ان سب کے لئے رحمت ہیں و ما ارسلناک الا رحمة للعالمین یہ آیہ کریمہ بتاتی ہے عالم اسی ہزار ہوں یا اسی لاکھ حضور ﷺ سب کے لئے رحمت ہیں اور ہر عالم کے رسول ہیں جس کی طرف قرآن مقدس نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے لیکون للعالمین نذیرا تاکہ آپ عالمین کے لئے نذیر ہو جائیں۔

الرحمن الرحیم

﴿۴﴾ اللہ تعالیٰ کے ان دونوں ناموں میں مبالغہ ہے یعنی بے حد رحم کرنے والا ہر لمحہ رحم کرنے والا رحمت سے مراد بندے پر ہر نعمت ہر فضل ہر کرم کا انعام ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے ہماری نااہلیوں کے باوجود وہ ہم پر رحم فرماتا ہے۔ ”رحمان“ کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اللہ بندوں پر ایسی رحمتیں فرماتا ہے جن کا ظہور بندوں سے قطعاً نہیں ہو سکتا۔ ”الرحیم“ کے معنی یہ ہیں کہ جس کی مثل کچھ نہ کچھ بندوں سے بھی حاصل ہو سکے رحمان کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ بندوں پر بلا واسطہ رحم فرماتا ہے اور رحیم کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ بندوں کے واسطے سے رحم فرماتا ہے۔

اکثر جاندار چیزیں اپنے ماں باپ کے ذریعہ سے پرورش پاتی ہیں لیکن کوئے کا بچہ اس سے مختلف انداز میں پرورش پاتا ہے جب انڈے سے نکلتا ہے تو اس کی ماں اس سے بالکل بے تعلق ہو جاتی ہے وہ گوشت کا لوتھڑا سا ہوتا ہے اس پر پھر جمع ہو جاتے ہیں وہ ان کو لقمہ بنا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کے پر ہو جاتے ہیں۔

(روح البیان کبیر بحوالہ نعیمی ج 1 ص 14)

تفسیر نعیمی کے اسی مقام پر اسی عنوان سے حضرت ذوالنون مصری کا ایک واقعہ ملتا ہے فرماتے ہیں میں ایک دن دریا کے کنارے جا رہا تھا ایک بچھوتیزی سے دوڑتا ہوا دریا کی طرف آ رہا ہے جب وہ بچھو دریا کے کنارے پہنچا تو اچانک ایک کچھو کنارے پر آیا وہ بچھو اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا اور کچھو اسے لے کر دوسرے کنارے کی طرف چل دیا۔ فرماتے ہیں میں بھی حیران کن منظر دیکھنے کیلئے کشتی پر سوار ہوا کہ دیکھوں یہ معاملہ کیا ہے بچھو دوسرے کنارے پہنچ کر کچھوے کی پیٹھ سے اتر اور تیزی سے آگے دوڑا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا کچھ دور جا کر دیکھا ایک نوجوان سو رہا ہے اس کے قریب ایک زہریلا سانپ ہے، جو اسے ڈسنا چاہتا ہے اچانک اس بچھو نے سانپ پر حملہ کیا اور سانپ نے اس پر، یہ دونوں ایک دوسرے کو ڈستے رہے اور ایک دوسرے کے زہر سے مر گئے اور وہ جوان بچ گیا۔

اس واقعہ سے رب قدوس جل مجدہ کا اپنے بندوں پر رحمان و رحیم ہونے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی کس طرح حفاظت فرماتا ہے کچھ وہ مشکلات ہیں جو ہماری ظاہری کوشش سے ٹل جاتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں ہماری محنت، کوشش، ہمت سب جواب دے دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی بچاتا ہے وہ اس کی رحمانیت کا ظہور ہے یہاں پر رحمت کو دو الگ الگ ناموں سے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ اللہ رحمان ہے رحیم ہے اللہ کی صفت ربوبیت کے بعد جس صفت کا جلوہ نظر آ رہا ہے وہ صفت رحمت ہے اسی عنوان کی طرف قرآن مقدس کا اشارہ واضح نظر آتا ہے ”رحمتی وسعت کل شئی“ اور میری رحمت دنیا کی ہر شئی کو گھیرے ہوئے ہے۔

ضروری تھا کہ اس صفت کا ذکر بھی خصوصیت سے ہوتا اور دونوں ناموں کا مبالغے کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ ”الرحمن“ میں یہ مفہوم ہے کہ اس میں رحمت ہے۔ ”الرحیم“ میں یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ ہر لحظہ رحمت فرماتا ہے۔

اس کائنات ہستی میں صرف پرورش ہی نہیں بلکہ اس سے اوپر ایک نظام ہے جس سے نظام ربوبیت کے حسن میں نکھار ہے، اس کی مہک میں عطر بیزی ہے وہ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہے اس کائنات کے اندر انسان ہو یا حیوان نباتات ہوں یا کوئی دوسری شئی اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر مخلوق کے اندر آئے دن ایک نئی شان نئی آن دکھائی دیتی ہے اور ہر شئی کا راستہ بڑھاؤ کی طرف نظر آتا ہے گھٹاؤ کی طرف نہیں پودے کو شروع سے دیکھیں بڑھتے بڑھتے پھول اور پھل تک پہنچ جاتا ہے جو حسن ہی حسن ہے انسانی بچے کو دیکھیں پنگھوڑے سے لے کر جوانی تک مختلف بہاروں رعنائیوں سے گذرتا ہے کائنات کا یہ سارا تصور حسن اور کمالات کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ سارے کا سارا رحمت ہے اور رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ حسن ہو، خوبی ہو، بگاڑ نہ ہو اگر اس پر خیال کریں کہ کائنات کے اندر یہ اعتدال اور حسن کیوں ہے تو جواب ملتا ہے کہ رب قدوس کی صفت رحمت بھی ہے اور یہ صفت رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے اور جس ذات میں

رحمت ہو تو جو کچھ وہاں سے صادر ہوگا اس میں بہتری ہی ہوگی حسن ہوگا خوبی ہوگی۔

کائنات پر نگاہ ڈالیں تو اللہ تعالیٰ کی انہیں صفات مقدسہ رحمان و رحیم کی حسین چادر تنی ہوئی دکھائی دیتی ہے کائنات کی ہر شئی کا میرے تابع ہونا میرے لئے ہونا انہیں صفات مقدسہ کی تجلیات ہیں قرآن مقدس فرماتا ہے ”سخر لکم ما فی السموات والارض جمیعا“ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔

چاند، تارے، سورج، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ ان سب میں ہمارے لئے طرح طرح کے فائدے ہیں اور ہم راحت و سکون حاصل کر رہے ہیں یہ انہیں صفات مقدسہ کی جھلک ہے زمین پر غور کریں تو اس پر پھولوں اور پھولوں کی فراوانی اس کی تہہ میں سونے چاندی کے ذخائر اس پر بہنے والے دریاؤں، سمندروں کی تہہ میں موتی، مونگے، مرجان، ایسے قیمتی سامانوں کی بہتات زمین پر چلنے والے چارپائے فضا میں اڑنے والے پرندے سمندر میں تیرنے والی مچھلیاں یہ سب کی سب چیزیں انسانی نشوونما اس کی سہولت اور راحت کے لئے ہیں۔ طرح طرح کے سامان سچے بچھے نظر آتے ہیں یہ انہیں صفات مقدسہ رحمان و رحیم کا پر تو ہے۔

اس کارخانہ ہستی سے فائدہ اٹھانے والا امیر ہو یا غریب، چھوٹا ہو یا بڑا، فضا میں اڑنے والا پرندہ ہو یا زمین پر چلنے والا جانور ہر ایک کا فائدہ اٹھانا کمال رحمت نہیں تو کیا ہے اگر بادشاہ اپنے محل میں بیٹھ کر محسوس کرتا ہے کہ کارخانہ ہستی اس کے سکون کے لئے ہے، تو چیونٹی بھی اپنی بل میں یہ کچھ محسوس کر سکتی ہے، غرض کائنات کی کوئی شئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس کارخانہ ہستی کا وجود صرف اسی کے لئے ہے اور باقی مخلوق محروم ہے یہ انداز قدرت بھی اس کے رحمان و رحیم ہونے کی تفسیر جھلک ہے۔

﴿۵﴾ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی دو صفات کا ذکر ہوا ہے ربوبیت اور رحمت ان دونوں صفات کے بعد صفت عدالت کا ذکر ہے اور اس عظیم صفت عدالت کے عنوان کو ”مالک یوم الدین“ کے ارشاد

میں سمودیا گیا ہے لفظ دین کے معنی بدلہ اور مکافات کے آتے ہیں وہ بدلہ اچھائی کا ہو یا برائی کا معنی یوں ہوگا وہ جزا کے دن کا حکمران ہے، قرآن مقدس نے اس دن کی حکمرانی کے متعلق ایک دوسرے مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا ہے ”لمن الملك اليوم لله الواحد القهار“ آج کس کی حکمرانی ہے اللہ تعالیٰ کی، جو وحدہ لا شریک ہے اور سب پر غالب ہے۔

ایک اور مقام پر یہی عنوان اس طرح ملتا ہے الملك يومئذ لله يحكم بينهم اس دن صرف اللہ کی بادشاہی ہوگی وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور ہر شخص کو اس کی نیکی اور بدی کا پورا پورا بدلہ دے گا اس عنوان کو قرآن مقدس نے ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا ہے فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره جو ذرہ بھرنیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو ذرہ بھربرائی کرے گا اس کی سزا پائے گا اگر یہ دن نہ ہو (معاذ اللہ) تو دنیا میں مظالم ڈھانے والے سزا سے بچ نکلیں گے۔ اور دنیا میں مشکلات و مصائب سہتے سہتے مرنے والے جزا سے محروم رہ جائیں گے ضروری تھا کہ ایسا دن ہو جس میں ہر ایک کو اس کے کئے کی جزا و سزا ملے گی۔ وہ دن قیامت کا دن ہے کافر اپنے کئے کی سزا میں مبتلا رہے گا اور یہ دن اس کیلئے پچاس ہزار برس کا دن ہوگا مومن بارگاہ قدس کے بے شمار انعامات حاصل کرنے خصوصاً دیدار الہی میں اس قدر محو ہوگا کہ دن کا طویل ترین ہونا اسے محسوس ہی نہیں ہوگا، حتیٰ کہ وہ جتنی دیر میں نماز پڑھ لیتا تھا وہ دن اس کیلئے اس سے بھی کم محسوس ہوگا۔ (تبیان ص ۱۸۰ ج ۱)

”مالک يوم الدين“ کے ارشاد گرامی میں زندگی کو عجز و انکساری اور شرم و حیاء سے گزارنے کا اشارہ مل رہا ہے تکبر و غرور سے بچنے کا کھلا درس ہے اس مہیب دن اور عدل و انصاف کے ترازو کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی اس دن پر جس قدر عقیدہ مضبوط ہوگا گناہوں سے بچنے برائیوں سے رکنے کا عزم بڑھتا رہے گا۔ اور یہ عقیدہ اسے اس دن بے کراں انعامات الہیہ کا حقدار بنادے گا۔ اور اس دن کا یاد نہ کرنا یا جزا و سزا کی حقیقت پر یقین نہ کرنا گمراہی میں ڈال دے گا جس کی سزا اسے قہر و غضب الہی کی صورت میں بھگتنا پڑے گی۔

قیامت کے دن کا مالک ہونے کا مفہوم یہ نہ لے لیا جائے کہ نہ جانے وہ صرف اسی کا مالک ہے! نہیں۔ وہ پوری کائنات کا مالک ہے اور ذرے ذرے کا مالک ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا مالک نہیں قیامت کا ذکر صرف اسکی ہیبت اور بڑائی کے اظہار کیلئے ہے یا اس لئے ہے کہ اس دن کو خصوصاً اللہ کی طرف منسوب کر کے اس دن کی عظمت کو اجاگر کرنا ہے۔ ربوبیت اور رحمت کے بعد قہر و جلال کی کسی صفت کا ذکر نہیں بلکہ عدالت کے تصور کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے صفات الہیہ میں عدالت ضروری ہے اس سے یہ بھی واضح پتہ چل رہا ہے کہ یہ کارخانہ ہستی جس طرح اپنے وجود کیلئے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت اور ربوبیت کا محتاج ہے ایسے ہی صفت عدالت کا بھی محتاج ہے اسے یوں سمجھ لیا جائے اللہ کی صفت ربوبیت پرورش کرتی ہے۔ رحمت فیض بانٹتی ہے اور عدالت سے خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ اور نقصان کا ازالہ ہوتا ہے۔

عدل کا معنی توازن ہے برابری ہے اعتدال ہے اس کائنات پر نگاہ کریں تو صفت عدل چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اعتدال ہے تو حسن ہے صحت ہے اعتدال بگڑا تو نظام خراب ہو گیا۔

انسان کے دونوں ہاتھ برابر ہوں تو اعتدال ہے حسن ہے کمی بیشی ہو تو نقص ہے عیب ہے۔ خوبصورتی نہیں۔ آنکھیں دونوں برابر ہوں تو چہرے کا حسن ہے ورنہ عیب ہے۔ چاند سورج کی گردش اعتدال سے ہٹ جائے تو نظام دنیا درہم برہم ہو جائے عدالت کا معنی برابر ہونا کمی بیشی نہ ہونا۔ حاکم چونکہ فریقین کے درمیان ایسا فیصلہ کرتا ہے جو حق و انصاف اور عدل پر مبنی ہو اسی لئے اسے عدالت کہتے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

إِيَّاكَ تَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝

اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں ﴿۶﴾
اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ﴿۷﴾

تفسیر

﴿۶﴾ بارگاہ قدس جل مجدہ میں انتہائی عجز و انکساری کو ”عبادت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ عجز و انکساری اسے معبود حقیقی جان کر کی جائے۔ اگر کوئی بیٹا باپ کے حضور، غلام آقا کے حضور، شاگرد استاد کے حضور عجز و انکساری سے حاضری دے تو یہ عبادت نہیں ہوگی کہ یہ بندہ اپنے استاد، باپ، آقا کو معبود نہیں سمجھتا۔ لہذا والدین اور بزرگوں کا ادب و احترام عبادت کے معنی میں نہیں آئے گا۔

اگر کوئی شخص اللہ کے بغیر کسی کو سجدہ کرتا ہے اور کہتا ہے میں اسے معبود نہیں سمجھتا کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟ ہرگز نہیں ہماری شریعت مطہرہ میں غیر خدا کیلئے سجدہ تعظیمی کی بھی شدید مخالفت ہے۔

”ایاک“ میں خطاب ہے گویا نمازی۔ اپنی اس عبادت کے دوران اپنے رب قدوس کو دیکھ رہا ہے اس مفہوم کی تائید میں حدیث پاک بھی ملتی ہے ”صل کانک تراہ“ ایسے نماز پڑھ گویا اپنے معبود حقیقی کو تو دیکھ رہا ہے۔ خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اسی عنوان کو اس طرح پیش فرمایا

آئیں کہ در نماز نہ بیند جمال دوست فتویٰ ہی دہم کہ نماز خود قضا کند

جو شخص نماز پڑھے اور جمال محبوب سے بہرہ ور نہیں ہوتا، میں فتویٰ دیتا ہوں وہ نماز دوبارہ پڑھے۔

”ان تعبد اللہ کانک تراہ“ اس طرح اللہ کی عبادت کر گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے۔

(مسلم شریف ص 27 ج 1)

”نعبد“ سے پہلے ”ایاک“ میں حصر کا فائدہ مل رہا ہے کہ ہم عبادت صرف تیری ہی کر رہے ہیں، یا اسے یوں سمجھ لیا جائے بندہ نماز کی حالت میں پہلے اپنے رب سے دور تھا نماز شروع کی تو قریب ہو گیا اور

”ایاک“ سے خطاب کیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا مفتی احمد یار خاں علیہ الرحمہ نے اس عنوان پر حسین تبصرہ کیا ہے فرماتے ہیں ”ایاک نعبد“ سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پانچ اسماء گرامی آئے ہیں اللہ، رب، رحمان، رحیم اور مالک گویا یہ فرمایا ہم نے تمہیں پیدا کیا لہذا میں اللہ ہوں، پھر تم کو پالا لہذا رب ہوں، تم نے گناہ کئے میں نے چھپائے رحمان ہوں، تم نے توبہ کی میں نے معافی دی لہذا رحیم ہوں، تم میرے قبضے میں ہو اور جزا سزا کا دن بھی آنے والا ہے لہذا میں مالک ہوں۔ اے بندے! تو میری عبادت کر، عبادت کے لائق وہی ہے جس میں یہ صفتیں موجود ہوں، لہذا یہ کہو اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ ”نعبد“ جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے کہ اپنی عبادت کو کالمین کی عبادت سے ملا دے تاکہ ناقص عبادت بھی اُن کے ساتھ ملنے سے کامل ہو جائے۔

اے اللہ میں تیرے حضور اکیلا نہیں آیا بلکہ تیرے مقبولین بارگاہ بندوں کے ساتھ حاضر ہوا ہوں کہ میری عبادت قبولیت کے لائق نہ ہو تو ان مقبولین بارگاہ کا صدقہ قبول فرمالے۔ ”ایاک“ میں یہ بھی اشارہ واضح ہے کہ اے اللہ میری عبادت کسی بھی اور مقصد کیلئے نہیں۔ میں صرف اور صرف تیری رضا چاہتا ہوں جب اخلاص کی یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو حالات میں یکسر تبدیلی ہوگی اور یہ بندہ بھی مقبولین بارگاہ میں شمار ہونے لگے گا۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا دل صاف آئینہ کی مانند ہوتا ہے جب گناہ کرتا ہے تو میلا ہوتا جاتا ہے اب اسے صاف کرنے کیلئے بہترین صورت یہ ہے کہ خلوص سے اس اللہ کی عبادت کی جائے۔

﴿۷﴾ یہاں پر استعانت سے عموم مراد ہے کہ ہر چیز میں ہم تجھ سے ہی استعانت کرتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ”اِذْ اسْتَعْنَتْ فاستعن باللہ“ جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے

کروایساک نستعین کا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اے ہمارے اللہ ہم اپنی عبادات اطاعات اور اپنے تمام معاملات میں صرف تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ کفار و مشرکین اپنے معاملات میں اپنے باطل معبودوں سے مدد طلب کرتے تھے اور ہم اپنے اخلاص سے تمام معاملات میں تیری ہی مدد طلب کرتے ہیں اس آیت کریمہ سے کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ اللہ کے بغیر کسی سے کچھ استعانت لینا شرک ہوگا لہذا اولیاء اللہ سے مدد مانگنا حرام ٹھہرا ہے۔

اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہاں اگر کوئی شخص انبیاء و اولیاء کو مستقل بالذات مان کر ان سے مدد طلب کرتا ہے تو صحیح نہیں اگر کسی اللہ کے مقبول بندے کو محض رحمت الہی کا واسطہ سمجھ کر اس سے استعانت کی جائے تو جائز ہے کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ سے ہی استعانت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ دربار رسالت میں اس طرح درخواست کرتے ہیں

و انت مجیری من هجوم ملمة اذا انشبت فی القلب شر المخالب
اے اللہ کے محبوب آپ مجھے مشکلات میں پناہ دیتے ہیں جب مشکلات و مصائب گھیر لیتی ہیں (ضیاء القرآن)
بعض لوگوں کے اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کیلئے قرآن مقدس کا یہ ارشاد کافی ہے۔

”و ابتغوا الیہ الوسیلہ“

اسکی طرف وسیلہ تلاش کرو

”واستعینوا بالصبر والصلوة“

استعانت (حاصل) کرو صبر سے اور نماز سے۔

یہاں صبر اور نماز سے استعانت لینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمانا ”من انصاری الی اللہ“ میرا مددگار کون ہے اللہ کی طرف، ”وتعاونوا علی البر والتقویٰ“ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ بے شمار ایسے مقامات سے ظاہر ہے اولیاء، انبیاء سے مدد لینا جائز و

درست ہے۔ البتہ عقیدہ یہی ہو کہ یہ اُن کی ذاتی قوت نہیں، خدا کی عطا کردہ ہے۔

یہ بھی معنی کیا گیا ہے اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور اس عبادت کو مکمل کرنے اور خلوص سے ادا کرنے میں ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں کہ اگر تیرا فضل و کرم نہ ہوگا تو شیطان ہمیں اس اخلاص و محبت کے انعامات سے محروم کر دے گا۔ یہ بھی معنی ہوگا کہ اے اللہ ہم نے تیری عبادت کا راستہ اختیار کیا ہے اس پر چل پڑے ہیں اب اس پر ثابت قدم رکھنا اور منزل پر پہنچانا تیرا کام ہے۔ اور وہاں تک پہنچنے کیلئے ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اگر تیرا تعاون نہ ہو تو شیطان ہمیں بہلا پھسلا کر راہ حق سے دور کر دے گا۔ بندہ جب عبادت میں مصروف ہوتا ہے تو رحمانی اور شیطانی لشکر کی جنگ ہوتی ہے اے اللہ اس جنگ میں ہماری مدد فرما۔ ایک معنی یہ بھی ہے، اے اللہ جس طرح ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اسی طرح ہم صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں اگر یہ مدد کسی بندے کی طرف سے بھی ہے تو یہی سمجھ کہ یہ مدد بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ خدا کی طرف سے مدد کا ہر پہلو ذاتی ہے اگر غیر اللہ کی طرف سے مدد ہے تو سمجھ کہ یہ سب کچھ عطائی ہے، اللہ نے انہیں ایسا کرنے کی توفیق بخشی ہے اور یہ سارے اسی کے بندے ہیں اسی کے محکوم ہیں اس نظریہ کے تحت یہ سارے فرسودہ خیالات ختم ہو جاتے ہیں۔

شیخ ابن تیمیہ اپنی کتاب فتاویٰ ابن تیمیہ میں لکھتے ہیں ”اگر کوئی انبیاء اور صالحین کے وسیلہ سے سوال کرتا ہے اس دعا کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک ان مقبولین بارگاہ کی وجاہت ہو تو یہ دعا صحیح ہے“

(فتاویٰ ابن تیمیہ ص 211 ج 1 تبیان ص 197 ج 1)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ہمیں سیدھی راہ پر چلا ﴿۸﴾

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

تفسیر

﴿۸﴾ عبادت اور استعانت کے ذکر کے بعد دعا کا ذکر ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ”الدعاء مخ العبادة“ دعا عبادت کا مغز ہے اس عنوان کی واضح تشریح ہے۔

قرآن مقدس میں بیسٹار دعاؤں کا ذکر ہے سورہ فاتحہ شریف میں سب سے پہلی دعا ”سیدھی راہ پر چلا“ کا ذکر ہے کہ پتہ چل جائے کہ یہ دعا زندگی کے ہر مرحلے پر کارآمد ہے۔ کاروبار، لین دین، خاندانی معاملات دنیاوی تعلقات سب میں یہ دعا ہے اے اللہ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں سیدھی راہ پر قائم رکھ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے اے اللہ ہمیں عبادت پر ہمیشہ کیلئے ثابت قدم رکھ ایسا نہ ہو کہ چند دن عبادت کریں اور پھر چھوڑ کر بیٹھ جائیں۔

یہ معنی بھی ہے کہ اے اللہ ہمیں عبادت کے بعد تکبر و غرور سرکشی سے بچا کر صحیح راہ پر چلانا کہ بعض اوقات عبادت و ریاضت ایسے معاملات بندے کو مغرور کر کے سرکش و منکر بنادیتے ہیں جس سے اس کی ساری ریاضت و عبادت برباد ہو جاتی ہے۔ جیسے ابلیس عبادت میں سب سے آگے تھا اسکی عبادت نے اسے مغرور کیا جب فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس کے غرور نے اسے برباد کر دیا اور کہہ دیا ”خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ“ اے اللہ مجھے تو تو نے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے پھر میں اسے سجدہ کیوں کروں؟

اس لفظ ”اھدنا“ میں بھی جمع کا استعمال ہے کہ یہ بندہ صرف اپنی ہدایت ہی نہیں چاہتا باقی انسانوں کیلئے بھی دعا گو ہے کہ ہم سب کو ہدایت دے اور امن و سکون بھی اسی طرح ہی ہو سکتا ہے کہ سب لوگ ایک ہوں اگر ہزار برے آدمیوں میں ایک صالح ہو تو اسکی زندگی تو اجیرن ہو جائے گی بندہ یہ دعا

کر رہا ہے اے اللہ ہم سب کو ہدایت دے تاکہ ہم سارے امن و سکون سے تیری بندگی کر سکیں۔ سب لوگوں کو دعا میں شامل کرنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ اگر میری دعا اس لائق نہیں کہ قبول کی جائے تو ہو سکتا ہے باقی ہزاروں انسانوں میں کئی ایسے بھی ہوں گے جو مقبول الدعوات ہوں جنکی دعائیں مسترد نہ ہوتی ہوں تو ان کے صدقہ سے میری دعا بھی قبول ہو جائے گی

دعاء کے قواعد و ضوابط اور فوائد کے عنوان سے میری کتاب ”ذوق دعا“ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اب ہدایت کے کئی پہلو ہو سکتے تھے۔ بندہ درخواست گزار ہے یا اللہ سیدھی راہ پر چلا، صراط کا معنی کھلی واضح راہ کا ہے۔ یا صراط کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کیلئے کھلی، چوڑی راہ کے بجائے (موڑے) سمجھ لیا جائے۔ مستقیم کے معنی سیدھی راہ ہے کئی راستے تو ہوتے ہیں منزل پر بھی پہنچا دیتے ہیں مگر کٹھن، مشکل، ٹیڑھے، خطرات سے بھرے ہوئے اور انتہائی دیر سے پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ بندہ درخواست کرتا ہے کہ اے اللہ! سخت قسم کی مشکل راہوں سے بچا کر مختصر و سیدھی راہ پر چلا، کہ میں منزل مقصود پر جلد پہنچ جاؤں۔

اهدنا الصراط المستقیم کی ایک تفسیر اسلام اور قرآن کے ساتھ بھی کی گئی ہے ہمیں اسلام پر ثابت قدم رکھ اور قرآن مقدس کے احکام پر چلا۔ الصراط المستقیم حضور ﷺ کا اسم مبارک بھی ہے۔ (التبیان سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ ص 31)

اس آیت مبارکہ کا یہ مفہوم کہ اے اللہ ہمیں حضور ﷺ تک پہنچا، یہ معنی تمام معانی پر حاوی ہے کہ حضور پاک ﷺ تک رسائی ہوگئی تو سب کچھ مل گیا۔

اس آیت کریمہ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی ذات پاک کا دیدار ہوا اسکی رضا نصیب ہو، جنت الفردوس عطا ہو، ہدایت کا معنی راہ دکھانا بھی ہے اور کسی کو منزل مقصود تک پہنچانا بھی ہے۔ حضور ﷺ کی ذات والا صفات کیلئے یہ دونوں صورتیں حاصل ہیں آپ نے راہ دکھایا بھی ہے اور منزل مقصود تک پہنچایا بھی ہے۔ یہ معنی بھی ہے کہ اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت پر قائم رکھ اور ہمیشگی بخش، اس معنی کی

تائید میں قرآن مقدس کا ارشاد اس طرح ملتا ہے۔

”رَبَّنَا لَا تَزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا“

اے ہمارے رب ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا۔

خود حضور ﷺ نے ایسی دعا فرما کر ہمیں دعا مانگنے کی راہ پر چلایا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ اکثر و بیشتر یہ دعا فرمایا کرتے۔ ”يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ“ (اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ)۔ (ترمذی ص ۳۲۲)

ہدایت کی کئی صورتیں ہر فرد کیلئے حاصل ہیں مثلاً ہدایت فطری جو ہر بچے کو دے دی جاتی ہے کہ رونا کیسے ہے؟ دودھ کیسے پینا ہے؟ ہدایت عقلی ہر کس و ناکس کو ہے، مسلمان ہو یا کافر ہدایت حسی ہر فرد کو ہے کہ وہ بھلائی، برائی محسوس کرتا ہے۔ برف، آگ کو جانتا ہے۔

ایک قسم ہدایت الہیہ ہے جو صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہی ملتی ہے اس ارشاد گرامی میں بھی اسی ہدایت الہیہ کو مانگا جا رہا ہے اور اسی پر ثبات قدمی کی درخواست کی جا رہی ہے۔ اس ہدایت سے مراد عام ہدایت بھی ہے کہ احکام شریعت پر پابندی، دین کی پاسداری اسلام سے وابستگی پر ثابت قدمی نصیب رہے، خاص ہدایت بھی ہو سکتی ہے جو اہل اللہ کو حضور ﷺ کے خصوصی قرب سے ملتی ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِيبِهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهِ وَصَحْبِهِ بَعْدَ دُخْلِقِهِ

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ﴿۹﴾

تفسیر

﴿۹﴾ پچھلی درخواست میں سیدھی راہ مانگی گئی تھی اب کوئی شخص بھی کہہ سکتا تھا کہ میں سیدھی راہ پر ہوں اور کسی بھی راہ کو سیدھی راہ کہہ سکتا تھا اسکی وضاحت فرمادی گئی اے اللہ ان بندوں کی راہ پر چلا جن پر تو نے

خاص انعام فرمایا۔ جس راہ پر تیرے محبوب بندے چلے، اسی پر ہم کو چلا۔ اس راہ پر ان کے قدموں کے نقوش ہماری راہنمائی کرتے رہیں گے اور ہم بھی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ اب کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ انعام یافتہ لوگ اسی کے پسندیدہ لوگ ہیں تو قرآن مقدس نے دوسری جگہ انعام یافتہ لوگوں کی وضاحت کر دی کہ وہ ہیں کون؟

اولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين

انعام یافتہ لوگ انبیاء ہیں صدیقین ہیں شہداء ہیں اور نیک لوگ (اہل اللہ) ہیں

اس تشریح کے بعد سیدھی راہ کا مفہوم سمجھنے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا یہی راستہ محفوظ ہے کہ اس میں اللہ کا فضل و کرم اور انبیاء صدیقین شہداء صالحین کی نگرانی شامل ہے۔

انکی محبت، انکی اطاعت، انکی راہنمائی راستہ کے چوروں ڈاکوؤں سے بچائے رکھے گی اور یہ مسافر اللہ کے فضل سے بخیر و عافیت منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اچھے لوگوں کی اتباع اچھی چیز ہے اور بُرے لوگوں کی صحبت بہر حال بری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم نے اللہ والوں کی راہ پر چلنا اپنا رکھا ہے انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ چلنے والے کون ہیں، ارشاد ہوتا ہے ”ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم“ ترجمہ: جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ ہوگا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

نہ اُن لوگوں کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ
گمراہوں کا ﴿۱۰﴾

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ

تفسیر

﴿۱۰﴾ صراط مستقیم کی پہچان مثبت انداز سے کرائی گئی، اے اللہ ہمیں ان لوگوں کی راہ پر چلا جو تیری طرف سے انعام یافتہ ہیں یہ مثبت پہلو تھا اب اس کی ضد اور مخالف پہلو کو بھی واضح کیا گیا۔ اے اللہ! ان لوگوں کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے نہ انکی جو گمراہ ہو گئے اور حق کی راہ سے بھٹک گئے۔ گویا سیدھی راہ کو واضح کرنے کیلئے دونوں گروہوں کا ذکر ہو گیا غضب کئے گئے اور انعام دئے گئے۔ اور یہ ایک ضابطہ ہے کہ حق و صداقت پر چلنے والوں کیلئے انعام ہوتا ہے اور گمراہ اور نافرمانوں کیلئے غضب ہوتا ہے۔ جو راہ نہ پاسکے اور گمراہ ہو گئے مغضوب ہوئے اور جو راہ پالینے میں کامیاب ہو گئے اور خداوندی انعام بھی حاصل کر لیا انعام یافتہ ٹھہرے۔

المغضوب علیہم کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اے اللہ یہود و نصاریٰ کی راہ سے بچا۔ امام ابن جریر نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس طبقہ مغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں۔ روح البیان میں اسی مقام پر وضاحت سے تحریر ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ انعام یافتہ لوگوں میں انبیاء اولیاء صلحاء ہیں اور مغضوب علیہم میں ہر گمراہ طبقہ (وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا کوئی دوسرا جو حق کی راہ سے بھٹک گیا) ہے۔

قرآن مقدس کے ان ارشادات عالیہ سے کس قدر واضح اور کھلا اصول مل رہا ہے کہ انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہی سیدھی راہ ہے اسی پر چل کر ہی کامیابی ہو سکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اولیاء امت انہیں لوگوں کی راہ ہی سیدھی راہ ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

آمین

حضور ﷺ نے فرمایا ”اذا قال الامام ولا الضالین قولوا امین“ جب امام ”ولا الضالین“ کہے تو تم ”آمین“ کہو اس کا معنی یہ ہے ”استجب دعاءنا“ اللہ ہماری دعا قبول فرما ایک اور حدیث شریف ہے جسے صاحب روح البیان نے اسی مقام پر درج کیا ہے ”علمنی جبریل آمین عند فراغی من قراۃ الفاتحۃ“ فاتحہ ختم کرنے پر مجھے جبریل نے آمین بتائی۔

حضور ﷺ نے فرمایا جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ (روح البیان)

آمین قرآن مقدس کی آیہ تو نہیں مگر مسنون ہے کہ فاتحہ کے بعد قاری اسے پڑھے یہ پھر ایک مرتبہ بارگاہ قدس میں درخواست ہے کہ اے اللہ میری دعا کو قبول فرما۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

سورہ بقرہ شریف

(یہ مدنی ہے ۲۸۶ آیات ہیں ۴۰ رکوع ہیں)

یہ سورہ مدینہ منورہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی اس میں عبادات کے علاوہ سیاسی، معاشی اصول بیان کئے گئے ہیں کہ مدینہ منورہ سب سے پہلی اسلامی ریاست ہے۔ اس لئے شدید ضرورت تھی کہ قواعد و ضوابط ایسے انداز میں ہوں جس سے اسلامی ریاست مضبوط ہو اور نظام حیات چلانے کیلئے کامیاب اصول بیان ہوں۔ اس کے برعکس مکی سورتوں اور آیات میں اعتقادات کا ذکر واضح ملتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر نے اس سورہ شریف کے بارہ میں فرمایا یہ سورۃ ایک ہزار خبر، ایک ہزار امر، ایک ہزار نہی پر مشتمل ہے۔ (ابن کثیر ص ۱۷۲ ج ۱)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک دن جبریل حضور ﷺ کے دربار میں حاضر تھے، اچانک حضور ﷺ نے آواز سنی اور سر اٹھایا، جبریل علیہ السلام نے عرض کی حضور یہ ایک آسمان کا دروازہ کھلا ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں کھلا۔ ایک فرشتہ نازل ہوا جو اس سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا، اس فرشتے نے حضور ﷺ کو سلام کیا اور عرض کی حضور آپ کو ان دونوروں کی خوشخبری ہو جو آج سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ ایک نور سورہ فاتحہ ہے اور دوسرا نور سورہ بقرہ ہے۔ (تبیان ص ۲۳۴ ج ۱)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس سورہ بقرہ کی ایک اور فضیلت اس طرح ذکر ہے فرماتے ہیں اسید بن خضیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک رات سورہ بقرہ شریف کی تلاوت کر رہے تھے ان کا گھوڑا اچانک کودنے لگا، انہیں محسوس ہوا کہیں ان کا بیٹا بچہ جو قریب سویا ہوا تھا کچلا نہ جائے۔ فرماتے ہیں مجھے بچہ کی پریشانی تھی، میں کھڑا ہو گیا تو گھوڑا کودنے سے رک گیا جب دوبارہ تلاوت کی تو گھوڑا

دوبارہ اچھلنے لگا، فرماتے ہیں میں نے سراٹھا کر دیکھا تو چراغ چلتے دکھائی دیئے۔ میں نے صبح کو یہ واقعہ حضور ﷺ کو سنایا تو آپ نے فرمایا یہ فرشتے تھے تمہاری خوش الحانی کی وجہ سے قریب آئے اگر تم صبح تک پڑھتے رہتے تو لوگ انہیں دیکھ لیتے۔

سورہ بقرہ کا نام ”بقرہ“ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کی ایک گائے کا ذکر ہے، سورہ فاتحہ شریف میں اھدنا الصراط المستقیم کا ذکر ہے۔ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ اس سورہ شریف میں سیدھی راہ بتادی گئی ہے۔ وہ اسلام پر ثابت قدمی، شریعت کے قواعد و ضوابط اور ان پر استقامت ہے۔ اور درمنثور شریف میں حضرت ابوامامہ باہلی سے روایت نقل ہے حضور ﷺ نے فرمایا زہرا وین (سورہ بقرہ اور آل عمران) پڑھا کرو، وہ اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کریں گی۔ سورہ بقرہ پڑھا کرو وہ برکت ہے۔ سنن کبریٰ شریف میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے تین وجہ سے فضیلت ہے۔

1۔ تمام روئے زمین میرے لئے مسجد بنادی گئی۔

2۔ ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح ہیں۔

3۔ سورہ بقرہ کی آخری آیات جو عرش کے نیچے سے نازل ہوتی ہیں مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔

درمنثور شریف میں اسی مقام پر سیدنا حسن بصری سے یہ روایت بھی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا قرآن مقدس میں افضل سورہ بقرہ ہے جس گھر میں اسکی تلاوت ہو شیطان بھاگ جاتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت رحم فرمانے والا
بہت مہربان ہے۔ یہ خاص کتاب جس کے کلام
الہی ہونے میں کوئی شک نہیں ﴿۱۱﴾

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الْم ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ

تفسیر

﴿۱۱﴾ قرآن مقدس اپنے لئے اپنے اندر ایسے مضبوط دلائل رکھتا ہے کہ کسی کو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے اس کے مضبوط دلائل ہر عقلمند کو ماننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

”الم“ حروف مقطعات ہیں قرآن مقدس کے مشکل مقامات میں سے ایک حصہ یہ بھی ہے۔ یہ متشابہات کی ہی ایک قسم ہے بعض نے کہا کہ اس کا معنی صرف اللہ ہی جانتا ہے، درست نہیں کہا۔ صحیح یہ ہے ”ہذا سر بین اللہ ورسولہ“ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان رموز و اشارات ہیں۔

اگر یہ معنی کر لیا جائے کہ اللہ کے بغیر کسی کو پتہ نہیں تو حضور ﷺ پر یہ کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ پر یہ ایسی کتاب نازل ہوئی جس کے کئی حصوں کا صاحب کتاب کو پتہ ہی نہ ہو (معاذ اللہ)۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں۔ حم، الم، بعض نے ان حروف کے تاویلی معنی کئے ہیں جیسے اسی حصہ کے اوائل میں مقطعات پر تبصرہ موجود ہے۔ ان حروف کی تلاوت سے ثواب قرآن پاک پڑھنے کا ملتا ہے، سمجھ کچھ آئے یا نہ آئے، ان حروف کی تلاوت سے علمی تکبر و غرور بھی ختم ہو جاتا ہے اور بندے کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہے۔

”ذالک“ سے اشارہ یا تو ان سورتوں کی طرف ہے جو سورہ بقرہ سے پہلے اتریں یا اترنے والی آیات کی طرف ہے یا لوح محفوظ پر لکھی ہوئی آیات کی طرف ہے۔ تفسیر نعیمی میں روح البیان کے حوالہ سے ایک روایت نقل ہے۔ توراۃ شریف کی ایک ہزار سورتیں تھیں اور ہر سورۃ میں ایک ہزار آیات تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ قدس میں عرض کی، اے اللہ! اس کتاب کو کون پڑھ سکے گا حفظ کر سکے گا تو جواب ملا کلیم

!میں اس سے اعلیٰ شان والی کتاب نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کروں گا جسے اسکی امت کے بچوں کو بھی یاد کرا دوں گا۔

اسی سال (2005ء) کا ایک واقعہ ہے مجھے جامعہ کے تعلیمی شعبہ بنات الاسلام کی طالبات نے خطاب کی دعوت دی۔ میں نے اپنے خطاب میں افسوس سے کہا بیٹیو! آپ محنت نہیں کرتیں قرآن پاک حفظ کرنے میں چار چار سال لگا دیتی ہیں، آپ کی بد مختی جامعہ پر بوجھ ہے تو مجمع میں سے ایک چھوٹی سی بچی کھڑی ہو گئی اس نے کہا باباجی مجھ پر اللہ کا فضل ہے میں نے صرف سات ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا ہے۔ پھر اس کی معلمہ نے تصدیق کی اور بتایا اسکی منزل بھی خوب اچھی ہے۔

اس مبارک کتاب سے پہلے اترنے والی تمام کتابوں کے مضامین و عنوانات اس کتاب قرآن پاک میں جمع ہیں اس مبارک کتاب سے پہلے ایک سو تین کتابیں اتریں جن کی تفصیل روح البیان شریف میں اس طرح ہے۔

”شیث علیہ السلام پر 50 صحیفے، ادریس علیہ السلام پر 30 صحیفے، ابراہیم علیہ السلام پر 20 صحیفے، موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ، داؤد علیہ السلام پر زبور، عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل، قرآن مقدس کے 32 ناموں سے ایک نام ”الکتاب“ بھی ہے ان ناموں کی تفصیل تفسیر کبیر میں موجود ہے اور یہ نام قرآن مقدس کی مختلف آیات مبارکہ سے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ
بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

یہ اُن متقین کیلئے ہدایت ہے ﴿۱۲﴾ جو غیب
پر ایمان لاتے ہیں ﴿۱۳﴾ اور نماز کو قائم
رکھتے ہیں ﴿۱۴﴾ اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا
، اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے
ہیں۔ ﴿۱۵﴾

تفسیر

﴿۱۲﴾ اس آیہ مبارکہ میں قرآن مجید کا متقین کیلئے ہادی ہونے کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ پر ”ہدیٰ
للناس“ کا ارشاد بھی ہے کہ قرآن سبھی لوگوں کیلئے راہنما ہے۔ متقین کا ذکر فرمایا گیا کہ اس مبارک کتاب
سے صحیح استفادہ یہی طبقہ کرتا ہے۔ قرآن پاک تو سبھی کیلئے ہدایت ہے اگر کوئی گمراہ طبقہ فائدہ نہیں اٹھاتا تو
قرآن مقدس کے ہادی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے خدا نخواستہ کوئی شخص حضور ﷺ کو صادق الامین
نہ مانے تو حضور ﷺ کی سچائی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اندھا کسی شخص کو دیکھتا نہیں تو اس شخص کے وجود پر
کوئی فرق نہیں پڑیگا وہ شخص تو اپنی ذات میں قائم ہے نقص تو اندھے کا ہے۔

تقویٰ کی فضیلت

”تقویٰ“ بچنے کے معنی میں بھی آتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ کی
اطاعت کر کے اس کے غضب سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ اسلام اور شریعت کے قواعد و ضوابط کی حفاظت کرنا
بھی تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنا اور اسی سے متوجہ رہنا بھی تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے
رسول ﷺ کی کسی ناپسند چیز سے اپنے آپ کو بچانا بھی تقویٰ ہے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا

تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعب نے جواب دیا، عمر! کبھی آپ نے کانٹوں والا راستہ دیکھا ہے؟ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، دیکھا ہے۔ ابی بن کعب پوچھتے ہیں ایسی صورت میں تم کیسے چلتے ہو، عمر فاروق نے کہا کپڑا لپیٹ کر، چادر کو اونچا کر کے، فرمایا اسی کا نام تقویٰ ہے۔ گناہوں کے کانٹے جا بجا بکھرے پڑے ہیں عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر یہ راستہ طے کر لیا جائے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادات کو ٹھیک ٹھیک انجام دینا اور اس کی طرف سے منع کی گئی چیزوں سے بچنا تقویٰ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ کے عذاب سے بچنے کیلئے اپنے نفس کی خواہشات کو پامال کرنا اور اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھنا بھی تقویٰ ہے۔ قرآن مقدس نے اس تقویٰ کو نہایت بلند و بالا مقام دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

”ان اکرمکم عند اللہ اتقکم“

اللہ کے حضور زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اپنے رب قدوس جل مجدہ سے ڈرتے رہنا بھی تقویٰ ہے جیسے ارشاد ہے

”یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ“

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو۔

جیسے کسی چیز کے جائز اور ناجائز ہونے پر تسلی نہیں تو ایسے شبہات سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ تقویٰ کی عظمت قرآن مقدس میں ایک اور مقام پر اس طرح وارد ہے۔

”ان اللہ مع الذین اتقوا“

بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے

ایک اور مقام پر یہی عنوان اس طرح وارد ہے۔

”ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب“

جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہر مصیبت سے نجات دے گا اور اسے رزق اس طرح عطا فرمائے گا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے۔

تفسیر کبیر میں سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جو شخص چاہتا ہے کہ لوگوں میں اسکی عزت ہو تو وہ اللہ سے ڈرے اور پرہیزگاری اختیار کرے۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کبیر میں اسی مقام پر تقویٰ کی علامات کا بھی ذکر کیا ہے۔

☆ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: متقی وہ ہے جو اللہ کے مقابلہ میں کسی اور کو اختیار نہ کرے اور سب کچھ اللہ کے قبضے میں جانے۔

☆ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: متقی وہ ہے جو اپنے گناہ پر قائم نہ رہے اور اپنی عبادت پر غور نہ کرے۔

☆ ابراہیم بن ادھم فرماتے ہیں: مخلوق تیری زبان میں، فرشتے تیرے کاموں میں اور رب تعالیٰ تیرے دل میں عیب نہ پائے، یہ تقویٰ ہے۔

☆ واقدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تقویٰ یہ ہے جیسے جسم کو کپڑوں سے آراستہ کرتے ہو ایسے ہی دل کو حق تعالیٰ کیلئے سجاؤ۔ شک و شبہات سے بچنے کا نام بھی تقویٰ ہے۔

☆ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ اپنے کسی مقروض کے ہاں قرض کا مطالبہ کرنے گئے، دھوپ تھی۔ دستک دے کر دھوپ میں آجاتے حالانکہ دیوار کا سایہ موجود تھا۔ کسی نے عرض کی حضور دیوار کے سایہ میں کیوں نہیں کھڑے ہو جاتے؟ فرمایا ڈر لگتا ہے کہیں دیوار کا سایہ سودنہ بن جائے، کہ میں نے اس سے صرف رقم ہی لینی ہے اور اس دیوار کا مالک وہی مقروض ہے، سایہ میں کھڑا ہونے کی اس سے اجازت نہیں لی گئی میثاق کے عہد ”الست بربکم قالوا بلی“ کے عہد کو پورا کرنا بھی تقویٰ ہے۔

☆ ابن سیرین بہت بڑے مشہور تابعی ہیں تجارت کا کام تھا گھی کے منکوں میں سے کسی ایک منکے سے مراہو اچھا نکلا آپ کو خادم نے بتا دیا، مگر یہ خادم وہ منکا بھول گیا کہ ایک ہی شکل کے کئی منکے تھے۔ ابن سیرین نے سبھی منکوں کا گھی ضائع کروا دیا کہ شبہ پڑ گیا حالانکہ ایسی صورت کا شرعی حل ہو سکتا تھا کہ خادم کے غالب گمان پر کسی ایک منکے کو ضائع کر دیا جاتا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

متقین کی پہلی صفت

﴿۱۳﴾ اس آیہ مبارکہ میں متقین کی پہلی صفت بیان کی گئی ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ تصدیق بالقلب دل سے ماننا ایمان ہے۔ ایمان کے معنی امن دینا ہے چونکہ بندہ اچھے عقائد اختیار کر کے اپنے کو عذاب الہی سے امن دے لیتا ہے اسی وجہ سے اچھے عقائد اختیار کرنے کا نام ایمان ہے۔ ایمان کا ایک معنی بھروسہ کرنا بھی ہے۔ کہ مومن کو اپنے اچھے عقائد پر بھروسہ بھی ہوتا ہے۔ شریعت مطہرہ میں توحید و رسالت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کو دل سے ماننا ایمان کہلاتا ہے۔ ظاہری طور پر سر بہ سجود ہونا، احکام شریعت کی اتباع کرنا اسلام ہے۔ دل کی گہرائیوں سے عقائد دینیہ کو ماننا ایمان ہے۔

امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایمان کے دو جزء ہیں اقرار کرنا اور دل سے ماننا۔ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں تصدیق، اقرار اور عمل صالح ایمان ہے جسکی تصدیق میں خلل ہو وہ منافق ہے، جس کے اقرار میں خلل ہو وہ کافر ہے، جس کے عمل میں خلل ہو وہ فاسق ہے۔

ایمان اور اسلام کے بارے میں حضور ﷺ کا ایک ارشاد گرامی اس طرح ملتا ہے ایمان یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے فرشتوں پر اس سے ملاقات پر، اس کے رسولوں پر اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لاؤ۔ اور اسلام یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو اور فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ (صحیح مسلم شریف)

ایمان اور اسلام یہ دو لفظ ایسے قیمتی ہیں کہ جو ہمارے دین اسلام کے بارہ میں کھلی وضاحت ہے کہ یہ دین قتل و غارت، فتن و فسادات اور دہشت گردی کا دین نہیں بلکہ امن، سکون اور سلامتی کا دین ہے۔ ایمان کے بارہ میں خلاصہ کے طور پر یہ یاد رکھا جائے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا، حضور ﷺ کے دعویٰ نبوت کی تصدیق کرنا اور آپ کو مخبر صادق ماننا ہے۔ ایمان کے بارہ میں تصدیق بالقلب ہونے کے معنی کی تائید میں قرآن مقدس کی آیہ مبارکہ واضح دلیل ہے۔

”اولئک کتب فی قلوبہم الایمان“

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرمادیا۔

ایک اور مقام پر اسی عنوان کی تائید اس طرح ہوتی ہے

”قالو آمنا بافواہم ولم تومن قلوبہم“

انہوں نے اپنے منہ سے کہا ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل مومن نہیں

یہ دونوں آیات مبارکہ ایمان کے معنی تصدیق بالقلب کی تائید کرتی ہیں۔ ایمان بالغیب کی تشریح میں یہ بات سمجھ لی جائے کہ غیب ہر وہ شے ہے جو عقل و فکر کی رسائی سے بلند و بالا ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات اسکی صفات، انبیاء علیہم السلام کی نبوت، قیامت، جنت دوزخ، وحی یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہی جانی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی ذات گرامی کے واسطہ کے بغیر ان امور کی پہچان کا دعویٰ کرے تو وہ اپنے اس دعویٰ میں قطعی جھوٹا ہے۔ ایک معنی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے پیچھے بھی ایمان لاتے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے کہ مسلمانوں کے سامنے تو ایمان لائیں اور وہ نہ ہوں تو انکار کر دیں جیسے منافقین کرتے تھے، مسلمان سامنے نہ ہوتے تو کفار سے کہتے تھے ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

متقین کی دوسری صفت

﴿۱۴﴾ متقین کی دوسری صفت اس آیت کریمہ میں اس طرح ذکر ہے ”وَيَقِيمُونَ الصَّلَاةَ“ اور نماز کو قائم رکھتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں ایمان کے ذکر کے بعد اعمال کا ذکر بتاتا ہے کہ ایمان اصل ہے، بنیاد ہے۔ بنیاد مضبوط ہوگی تو مکان کی ساری تعمیر بھی مضبوط ہوگی۔ بنیاد کمزور ہے تو سارا مکان کمزور ہے۔ بنیاد مضبوط ہوگی تو سیلاب کا تیز ریلہ بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، بنیاد کمزور ہوگی تو سیلاب کا معمولی ریلہ بھی تباہ کر دے گا۔ قبر میں سوالات کے صحیح جوابات بنیاد کی مضبوطی ہے۔

ایمان کا ذکر اس لئے بھی پہلے ہے کہ ایمان دل کا کام ہے اور اعمال جسم کا۔ دل کو پورے جسم میں اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ ایمان تمام انبیاء علیہم السلام کے ادیان مقدسہ میں ایک سا ہی رہا مگر اعمال میں فرق رہا۔ ایمان کو اس لئے بھی اہمیت ہے کہ یہ سب پر فرض ہے بہ نسبت اعمال کے مثلاً نماز بچے پر دیوانے پر فرض نہیں ہے، حیض و نفاس والی پر فرض نہیں، حج غریب پر فرض نہیں۔

تمام اعمال صالح پر نماز کو اولیت دی گئی کہ باقی تمام احکام زمین پر نازل ہوئے یہ معراج کی شب عطا ہوئی۔ باقی اعمال سال میں ایک مرتبہ یہ دن میں پانچ مرتبہ۔ نماز کو قائم کرنے کا معنی ہے کہ باقاعدگی سے شرائط نماز کے ساتھ ہمیشہ پڑھتے ہیں کوتاہی نہیں کرتے۔ نماز کو اعمال صالحہ میں یوں بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں تمام مخلوقات کی عبادت جمع ہے۔ درختوں، پہاڑوں کی عبادت قیام، چوپائیوں کی عبادت رکوع، حشرات الارض کی عبادت بحالت سجدہ چلنا، یہ سب کچھ اس میں پایا جاتا ہے۔ نماز فرشتوں کی عبادت کو بھی جامع ہے کہ بعض فرشتے قیام میں، بعض رکوع میں اور بعض سجدے میں اور بعض تشہد میں، نماز میں یہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ نماز کی اہمیت کو قرآن مقدس نے ایک مقام پر اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

”ان الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنكر“

بے شک نماز برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے

اگر کوئی نماز بھی پڑھتا ہے گناہوں میں بھی مبتلا رہتا ہے تو یہ سمجھ لیا جائے نسخہ تو کامیاب ہے، اٹل ہے کہ حکیم مطلق نے ارشاد فرمایا مگر نماز پڑھ کر گناہ کرنے والا نسخہ کے استعمال میں بد پرہیزی کر رہا ہے۔ تو ظاہر ہے علاج کامل اسی وقت ہوگا جب بد پرہیزی بھی چھوڑے گا۔ نماز قائم کرنے کے مفہوم میں جہاں یہ ہے کہ باقاعدگی سے پڑھے ہمیشہ پڑھے وہاں سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی سامنے رہے کہ ”صل کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک او کما قال ﷺ“ ”نماز ایسے ادا کر گویا اپنے محبوب حقیقی کو دیکھ رہا ہے مگر تیری یہ کیفیت نہ ہو سکے تو اس یقین کے ساتھ تو پڑھ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے“ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے سالار عطاء رسول فی الہند حضرت خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ نے اس انداز نماز کو اس طرح ذکر فرمایا ہے

۔ آنکس کہ در نماز نہ بیند جمال دوست فتویٰ ہی دہم کہ نماز اوقضا کند

اس میں نماز کے اندر عجز و انکساری کے مقام کی طرف اشارہ ہے کہ جو بندہ نماز پڑھتے ہوئے اپنے محبوب کے جمال سے بہرہ ور نہیں ہوتا میرا فتویٰ یہ ہے کہ وہ نماز دوبارہ ادا کرے۔ یہ مقام اللہ کے خاص بندوں کا ہے ہم جیسے گنہگاروں کو کہاں نصیب۔ اگر ہم نماز کو اس کے فرائض و واجبات اور پابندی وقت کے ساتھ پڑھ سکیں تو یہ بہت بڑی بات ہے۔

قرآن مقدس نے جس طرح نماز میں اقامت کا حکم دیا ہے پورے دین میں بھی اقامت کا حکم ملتا ہے۔ ”ان اقمیوا الدین ولا تتفرقوا فیہ“ (دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو)۔ اقامت صلوٰۃ کے عنوان کو قرآن مقدس نے ایک دوسرے مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا۔ ”والذین ہم علی صلوتہم یحافظون“ (المومنون) (اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں)۔ ایک تیسرے

مقام پر یہی عنوان اس طرح ملتا ہے۔ ”الذین ہم علی صلوٰتہم دائمون“۔ (المعارج) (وہ لوگ جو نمازوں کو باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں)۔ سستی اور کاہلی سے نمازیں پڑھنے والوں کیلئے قرآن مقدس نے سخت وعید کا ذکر فرمایا ہے۔ ”فویل للمصلین الذین ہم عن صلوٰتہم ساہون“۔ (خرابی ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں)۔ اقامت صلوٰۃ کی اہمیت کو قرآن مقدس نے ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا ہے ”ما سلکم فی سقرۃ قالوا لم نک من المصلین“ (المدثر) (جنتی لوگ مجرموں سے پوچھیں گے تم کس وجہ سے جہنم میں آ گئے تو وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے)۔ اقامت صلوٰۃ کی اہمیت کو قرآن مقدس نے ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا ہے ”واقم الصلوٰۃ طرفی النهار وزلفا من اللیل“ (ہود) (دن کے دونوں کناروں، صبح و شام اور رات کے کچھ حصوں میں نماز کو قائم رکھو)۔ ”ان الحسنات یذهبہن السيئات“ (بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

متقین کی تیسری صفت

﴿۱۵﴾ اس آیہ کریمہ میں متقین کی تیسری صفت کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے ”اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اسی میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں“۔ یہاں پر رزق کا معنی صرف خوراک یا دولت نہ سمجھ لیا جائے بلکہ ہر وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے وہ خرچ کرتے ہیں، عالم ہے تو علم تقسیم کرے، زاہد و عابد ہے تو زہد و عبادت کے اصول سکھائے، مالدار ہے تو زکوٰۃ و صدقات ادا کرے، اخلاص و اتفاق سے نوازا گیا ہے تو وہ تقسیم کرے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ کے عشق و محبت کی دولت سے سرفراز ہے تو اس کو بانٹنے میں بھی بخل نہ کرے۔

یہ سارے انعامات الہیہ رزق میں شامل ہیں۔ رزق خرچ کرنے والوں میں سب سے بڑے سخی علماء، اصفیاء اور اہل اللہ ہیں جو اللہ کے بندوں پر علمی، عملی و روحانی فیوضات بکھیرتے ہیں۔ اسکی راہ میں

رزق خرچ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ رزق جو خرچ کیا جا رہا ہے وہ حلال ہو، طیب ہو اس عنوان کو قرآن مقدس نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔ ”یا ایہا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم“ (البقرہ) ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں اپنی حلال و پاک کمائی سے خرچ کرو۔

اگر کسی نے اللہ کی راہ میں رزق حرام خرچ کیا تو وہ اجر و ثواب سے محروم رہے گا۔ اگر کسی نے اپنے حرام رزق سے مسجد بنوادی تو یہ بندہ تو اجر سے محروم رہے گا البتہ یہ مسجد جو بنادی گئی اسے احترام مسجد کا ہی دیا جائے گا۔ اس میں نجس ہونے یا بے وضو ہونے کی صورت میں داخل ہونا منع ہوگا۔ ارشاد گرامی ہے ”مما رزقنا ہم“ میں اشارہ ہے کہ اپنے سارے مال سے کچھ خیرات کرو کہ یہاں پر ”من“ تبعیضیہ ہے اس کا معنی یہ بھی ہے کہ سارے مال سے جو رزق حلال ہے اس سے خرچ کرو اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ اگر یہ بندہ مالی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے تو سارا مال خیرات نہ کرے اس کا اپنی اولاد پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہی شمار ہوگا۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات والا صفات اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہوگی کہ ان کو ایمان عشق و محبت اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کی قوتیں حاصل تھیں۔ اسی بناء پر ہی حضور ﷺ نے مال کا کچھ حصہ بھی واپس نہیں فرمایا بلکہ سارا قبول فرمایا جب دریافت فرمایا گھر کیا چھوڑا ہے؟ تو عرض کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو۔ یہ کیفیت بغیر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کسی کو میسر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں رزق خرچ کرنے کے بارے میں اس آیت کریمہ سے حوصلہ لیا جائے کہ یہ رزق دیا ہوا ہی اُسی کا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

”وَمِمَّنْ دَابَّةٌ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا“ (زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور وہ جو ایمان لائیں اس پر جو اتارا گیا آپ
پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر
یقین رکھتے ہیں ﴿۱۶﴾

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْآخِرَةَ
هُمْ يُوقِنُونَ

تفسیر

متقین کی چوتھی اور پانچویں صفت

﴿۱۶﴾ متقین کی چوتھی صفت (علامت) بیان کی گئی ہے کہ وہ ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو حضور ﷺ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر نازل کی گئیں اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں۔ ”ما انزل“ کے حکم سے پتہ چلا تمام انبیاء علیہم السلام پر اتاری گئی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ کسی پہلی آسمانی کتاب کو مان لیا کسی کا انکار کر دیا، بعض کا اقرار کرنا اور بعض کو مان لینا ایمان نہیں بلکہ سبھی کتابوں کو ماننا ایمان ہے۔

اس آیت مبارکہ سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضور ﷺ پر نبوت ختم ہے اور آپ ہی خاتم النبیین ہیں اگر معاذ اللہ حضور ﷺ کے بعد بھی نبوت کا سلسلہ ہوتا تو اس کا بھی ذکر ہوتا کہ متقین وہ ہیں جو حضور سے پہلی کتابوں پر ایمان لائیں اور آپ کے بعد آنے والی کتب کو بھی مانیں مگر بعد کا ذکر نہیں فرمایا گیا جو عقیدہ ختم نبوت کی واضح دلیل ہے۔ جس طرح قرآن پاک کا ماننا ایمان ہے ایسے ہی ساری کتابوں کا ماننا بھی ایمان ہے۔ مگر پہلی کتابوں پر عمل نہیں، عمل صرف قرآن مقدس پر ہی ہے ان کتابوں کو ماننا کہ یہ آسمانی ہیں بس یہ کافی ہے۔ البتہ ان کتابوں کے بعض احکام جو قرآن مقدس نے ذکر کر دیئے ہیں ان پر عمل ضروری ہو گیا کہ ان احکام کو قرآن مقدس نے بیان فرمادیا۔

قرآن مقدس کے نازل ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔ جبریل علیہ السلام کا قرآن مقدس کو لوح محفوظ سے نیچے آسمان اول پر لانا بھی نزول ہے آسمان اول سے حضور ﷺ تک حسب ضرورت لانا بھی نزول ہے۔ مگر یہ سمجھنا کہ بغیر جبریل علیہ السلام کے حضور پاک ﷺ کو قرآن دیا ہی نہیں جاتا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ سورہ البقرہ شریف کی آخری آیات معراج کی رات حضور ﷺ کو عطا ہوئیں یہ آیات مبارکہ بغیر جبریل علیہ السلام کے عطاء ہوئیں۔ ”وما انزل علیک“ سے مراد قرآن مجید ہے اور وہ احکام بھی مراد ہیں جن کا ذکر قرآن مقدس نے بیان نہیں فرمایا مگر ان کی تفصیل و تشریح حضور ﷺ کی زبان پاک سے ملتی ہے۔ جیسے زکوٰۃ، روزہ، حج کے مسائل کی تشریحات اور حدود کی تفصیلات۔

یوم آخرت پر یقین رکھنا بھی انہی لوگوں کی صفات میں سے ہے آخرت پر یقین رکھنا اور اس دن کو جزا اور سزا کیلئے ماننا اعمال کی اصلاح کیلئے بہت ضروری ہے اگر آخرت پر یقین ہی نہیں جیسے کفار نے کہا کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے کا تصور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ (معاذ اللہ) یہ انداز فکر خدا کی نافرمانی، بد عملی تکبر و غرور اور سرکشی کو فروغ دیتا ہے۔ جب کسی کو جواب دینے کا تصور ہی نہیں، اچھائی اور برائی کی جزا و سزا کا نظریہ ہی نہیں تو وہ اپنی زندگی میں ہر شخص جو چاہے گا کرے گا۔ اگر یوم آخرت کا یقین ہوگا، جزا و سزا کا تصور ہوگا تو بد عملی اور گمراہی سے بچ سکے گا کہ آخرت کا خوف ہے۔ متقین کی اہم صفات میں سے پانچویں صفت یہ بھی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر
ہیں وہی فلاح (کامیابی) حاصل کرنے
والے ہیں۔ ﴿۱۷۰﴾

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

تفسیر

متقین کی چھٹی صفت

﴿۱۷۰﴾ متقین کی صفات میں سے یہ صفت چھٹی ہے اس سے پہلے متقین کی پانچ صفات کا ذکر ہوا ہے۔
غیب پر ایمان لانا، نماز قائم کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، قرآن پاک اور پہلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا
، یوم آخرت پر یقین رکھنا اب یہ چھٹی صفت ہے کہ ہدایت یافتہ یہی لوگ ہیں اور فلاح والے بھی یہی ہیں۔
متقین کی پہلی صف، پہلی جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو تقویٰ کے ہر معیار پر
ہر لمحہ پورے اترتے رہے۔ قرآن مقدس کا ارشاد ”علی ہدی“ بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہدایت پر غالب ہیں
یہ ان پر رب قدوس کا خاص انعام ہے کہ ہدایت سے الگ ہو نہیں سکتے۔ شیطان اور نفس انہیں گمراہ کرنے
میں ناکام ہے۔ ”مَن رَّبِّهِمْ“ کے ارشاد سے واضح ہے کہ متقین کیلئے ہدایت اور تقویٰ کی ساری صورتیں،
اُن پر اللہ کا کرم ہے، یہ بھی پتہ چلا کہ نیکی ہونے پر بندہ کو چاہئے کہ اس میں خدا کے خاص فضل و کرم کا قائل
ہو۔ کہ یہ اسی کی دی ہوئی قوت سے ہوئی اسی کے کرم سے ہوئی، اپنی ہمت، کوشش کو کوئی اہمیت نہ دے۔

متقین کی ساتویں صفت

متقین کیلئے ہدایت کے ذکر کے بعد فلاح پانے کا ذکر یہ ساتویں صفت کہی جاسکتی ہے۔ قرآن
مقدس نے فلاح کی صفت کا ذکر دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا ہے۔

”قد افلح من تزكى“

وہ کامیاب ہوا جس نے تزکیہ نفس کر لیا

(اپنے دل کو غیر سے ہٹا کر اپنے رب کی طرف متوجہ کر لیا اور ایسا کر لینا اسکی بہت بڑی کامیابی ہے۔)

معلوم ہوا یہ متقین فلاح کا مقام حاصل کر چکے ہیں فلاح کے عنوان پر مزید فرمایا گیا

”وذكر اسم ربہ فصلى“

فلاح والا اپنے رب کی یاد میں رہتا ہے

یارب کی یاد نے اسے اس مقام تک پہنچایا۔ نماز پڑھنے کی عادت اس میں راسخ ہو گئی ہے کہ فرائض، واجبات اور نوافل کی ادائیگی میں مصروف رہتا ہے۔ ان مقدسہ صفات کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ روحانیت کے مقامات کو طے کرنے کیلئے انہیں مقدس راستوں پر چلنا ہی مسافر کو منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ ساری راہیں شریعت کی راہیں ہیں اور شریعت کی اتباع ہی کامیابی کی ضامن ہے یہ تصور کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ حقیقت تک جانے کیلئے شریعت کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ بھی پتہ چلا صفت تقویٰ کتنی بڑی اہم صفت ہے اور خدا تک پہنچانے کیلئے شاہراہ ”یا موٹروے“ کا کام دیتی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

بیشک جنہوں نے کفر کیا برابر ہے ان پر آپ

انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں

گے۔ ﴿۱۸﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ

أَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸﴾

تفسیر

﴿۱۸﴾ یہ آیہ مبارکہ ابو جہل ابولہب وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی جو علم الہی میں ایمان سے محروم تھے۔ حضور

ﷺ ان کے ایمان نہ لانے سے پریشان رہتے تھے، تو یہ آیہ مبارکہ اُتری، انہیں حضور ﷺ کو تسلی دی گئی کہ آپ پریشان نہ ہوں آپ کی تبلیغ میں کسی قسم کی کمی نہیں، ان کا ایمان نہ لانا انکی اپنی بد نصیبی ہے، محرومی ہے، شامت اعمال ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ یہودیوں کے حق میں اُتری جنہوں نے مدینہ منورہ میں ایک محلّہ بنا لیا تھا اور حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے وہ کفر پر مر گئے ایمان سے محروم رہے۔ سیدنا ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ چاہتے تھے انہیں ہدایت ہو اور اسلام قبول کریں۔ تو فرمایا گیا محبوب ایمان وہی لائیں گے جن کیلئے ازل میں ایمان مقدر ہو چکا ہے اور وہی لوگ گمراہ رہیں گے جن کیلئے ازل میں گمراہی لکھی جا چکی ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ کفار ہیں جو میدان بدر میں مارے گئے (جامع البیان ص ۸۴ ج ۱)

کفر کا معنی چھپانے کا آتا ہے، عرب گاڑی کے ٹائر کو بھی ”کفرہ“ کہتے ہیں کہ وہ بھی ٹیوب کو چھپاتا ہے، کافر کو بھی کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مقابلہ میں تمام خوشبوؤں کو ڈھانپ دیتا ہے، لغت میں کاشکار پر بھی کفر کا لفظ استعمال ہوتا ہے کہ وہ بھی دانے کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں کافر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ جل مجدہ کے وجود یا اسکی توحید یا اُس کے کسی نبی کی نبوت یا دینی ضروریات میں سے کسی کا انکار کرے۔

”سواء علیہم“ میں اشارہ ہے کہ محبوب آپ کا انہیں ڈر سنانا یا نہ سنانا ان پر برابر ہے، آپ پر نہیں، آپ کو تو ان کو تبلیغ کرنے پر عظیم اجر ہوگا۔ قرآن مقدس میں کفر کا لفظ ناشکری کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے ”واشکروا لی ولا تکفروا“ مگر اس آیہ مبارکہ میں کفر سے مراد وہ عمل ہے جو ایمان کے مقابل ہے اسکی ضد ہے توحید و نبوت اور ضروریات دین کا انکار ہے۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں چھوڑو یا ر اسے دین کی بات سنانے کا کیا فائدہ مانتا تو ہے نہیں۔ ”سواء علیہم“ سے ان کے اس نظریہ کی تردید

ہو رہی ہے۔ مبلغ کو چاہئے وہ حق بات کہتا رہے اس کے نامہ عمل میں حق بات کہنے کا ثواب لکھا جاتا رہے گا۔ یہاں پر یہ سوال بے معنی ہوگا کہ اسلام نہ لانے میں ان کا قصور کیا ہے یہ قدرت کا ہی فیصلہ تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ جل مجدہ علام الغیوب ہے، اس کا علم کائنات پر محیط ہے اس کے علم میں تھا۔ انبیاء کی تبلیغ، ہدایت کے مواقع، اُن میں عقل و فکر کی موجودگی ہوگی مگر پھر بھی یہ لوگ کفر پر جے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس علم ازلی کی روشنی میں فرمایا ”لا یؤمنون“ ایمان نہ لانا دراصل ان کا اپنا ہی کردار ہے کسی قسم کا جبر نہیں انہیں زندگی میں اختیار دے دیا گیا تھا مگر یہ لوگ ہٹ دھرم رہے۔ اپنے اس دئے گئے اختیار پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے انہیں عذاب ہوگا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور انکی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کیلئے بڑا سخت عذاب ہے ﴿۱۹﴾

خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ
وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۹﴾

تفسیر

﴿۱۹﴾ کفار کی ہٹ دھرمی ضد اور سرکشی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید کو ہی سب کچھ سمجھ لیا۔ چاہئے تھا کہ وہ حق کو سمجھتے مگر انہوں نے اسلام کو محبت سے دیکھنے کی بجائے کفر سے والہانہ محبت شروع کر دی اور احکام خداوندی سے روگردانی کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی اس ضد کو مہر لگانے سے تعبیر فرمایا اور ان کے دل و دماغ، عقل و فکر سے وہ صلاحیت ختم کر دی گئی۔ نہ ان کے دل حق سوچنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نہ ان کے کان حق سننے کو اہمیت دیتے ہیں، انکی اس حالت کو بیان فرمایا گیا گویا ان کے دلوں اور کانوں پر مہر تھی اور وہ حق دیکھنے سے محروم ہو گئے کہ ان کی آنکھوں پر پردہ تھا۔ دل اور

کانوں پر مہر کا ذکر ہے اور آنکھوں پر پردہ کا کہ دل میں ہر طرف سے ہر قسم کے خیالات آسکتے ہیں، کان میں ہر قسم کی آوازیں ہر طرف سے آسکتی ہیں، اس لئے ان پر مہر کی ہی ضرورت تھی۔ چونکہ آنکھیں صرف سامنے سے ہی دیکھ سکتی ہیں اس لئے ان پر پردہ ہی کافی تھا۔

قرآن مقدس نے کفار کی اس حالت کا ذکر اور کئی مقامات پر بھی اسی طرح کے الفاظ سے فرمایا ہے مثلاً سورہ نحل شریف میں ہے

”اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبہم وسمعہم وابصارہم“

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں، اور آنکھوں پر مہر لگا دی گئی ہے دوسرے مقام پر قرآن مقدس نے کفار کے اس گستاخانہ رویہ اور کفر اختیار کرنے کو انہیں کی بد عملی اور انہیں کے کردار کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے۔

”کلاب ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون“

ہرگز نہیں ان کی اپنی بد اعمالیوں سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا ہے جیسے کوئی شخص اپنے شیشہ کو گرد و غبار سے نہ بچائے اسکی حفاظت کا احساس نہ کرے تو ظاہر ہے وہ شیشہ گرد و غبار سے اٹ جائے گا اب شیشے کا خراب ہو جانا، گرد و غبار سے اٹ کر اندھا ہو جانا، یہ عمل اس شخص کا اپنا ہی ہے ایسے ہی ان لوگوں نے اپنے دلوں کے شیشے کو کفر و شرک، ہٹ دھرمی کے گرد سے محفوظ نہ کیا تو ان کے شیشے برباد ہو گئے وہ سمجھ نہ سکے، سن نہ سکے، دیکھ نہ سکے۔ ان کی یہ حالت انہیں کے اعمالِ بد کا نتیجہ ہے مہر لگانے کا ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ ان کی بد کرداریاں اس حد تک پہنچ گئیں کہ مہر لگا دی گئی کہ اب وہ نیکی کو برائی سمجھنے لگے، کفر و شرک سے رغبت کرنے لگے، انبیاء علیہم السلام کی ہدایات پر عمل کرنے کی بجائے کفار و مشرکین سے دوستانہ مراسم پیدا کر لئے۔ اس انداز اور ارشاد میں حضور ﷺ کو حوصلہ دیا جا رہا ہے کہ محبوب! ان کے اس کردار سے آپ پریشان نہ ہوں اور ان کے ایمان لانے کی امید نہ رکھیں کہ یہ حق کو سمجھنے، دیکھنے کی

صلاحیتیں ہی ختم کر چکے ہیں۔ اب ان صلاحیتوں کے مراکز پر مہر لگ چکی ہیں، پردے پڑ چکے ہیں۔ اب ان کیلئے بڑا عذاب ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان کے راستے خود بند کر دیئے، راستے بند کرنے کے سارے اسباب انہوں نے خود جمع کر لئے تو اللہ نے راستے بند کر دیئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور کچھ لوگ کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور

قیامت کے دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ﴿۲۰﴾

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ
وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَهُمْ يَكْفُرُونَ

تفسیر

﴿۲۰﴾ پچھلی آیات مبارکہ میں مومنین اور کفار کا ذکر تھا ایمان اور کفر کی وضاحت کے بعد نفاق اور منافقین کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ منافق اسے کہتے ہیں جو لوگوں کے دکھاوے اور اپنی مصلحتوں کیلئے زبان سے تو اسلام کا اقرار کرے مگر دل سے انکار کرے۔ کچھ لوگ اسلام کی ہیبت سے متاثر ہو کر ظاہری طور پر تو مسلمانوں سے میل جول رکھتے، زبان سے اقرار کرتے مگر دل سے نفرت کرتے، کھل کر مخالفت اس لئے نہ کر سکتے تھے کہ نبوت کا آفتاب اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا جس کو جھٹلانا ان کے بس کی بات نہ تھی اور نہ ہی وہ اس روشنی کو اندھیرا کہنے کی ہمت کر سکتے تھے۔ کھلے انداز میں اسلام کی مخالفت انکی تباہی و بربادی کا باعث ہو سکتی تھی اس لئے انہوں نے دوہرا انداز اپنایا اور گمراہ ہو گئے۔ اس آئیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کو مومنین سے الگ قرار دے دیا چونکہ مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ زبانی اقرار کے ساتھ دل سے بھی تصدیق کرے اور یہ لوگ قلبی تصدیق سے محروم تھے، لہذا مومنین میں شمار نہیں کئے گئے اللہ تعالیٰ جل مجدہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کے زبانی دعوے کتنے ہی لمبے چوڑے کیوں نہ ہوں مگر بات اس وقت تک نہیں بنتی جب تک ان دعوؤں کی تصدیق دل نہ کرے۔ اس آئیہ مبارکہ کے

نزول کا سبب یہ بنا کہ مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابی نامی ایک شخص تھا جسے لوگ نہایت پیار اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے بارے میں لوگ اس حد تک خیال کرنے لگے تھے کہ اس کے اخلاق و کردار کی وجہ سے مکمل طور پر اسکی تاج پوشی کر کے اسے اپنا سربراہ مان لیا جائے۔ اسی دوران حضور سید عالم ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جلوہ فرما ہو گئے۔ اب حضور ﷺ کے ارشادات، آپ کے اخلاق، آپ کی وسیع ظرفی اور نبوت کے انوار و تجلیات نے اپنی جھلک دکھائی تو لوگ جوق در جوق حضور ﷺ کے دربار گوہر بار میں آنا شروع ہو گئے۔ عبداللہ بن ابی کو یہ بات کھاتی کہ لوگ انکی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اسی باعث اس کی تاج پوشی کا تصور بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ اسکی اس نامرادی، ناکامی نے اسے حضور ﷺ کا دشمن بنادیا مگر چونکہ چالاک تھا، زندگی گزارنے کا راستہ یہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے سامنے حضور ﷺ کے اوصاف بیان کرتا رہے تاکہ انکی مخالفت سے بچا رہے اور مسلمانوں کی غیر موجودگی میں حضور ﷺ کے خلاف باتیں کرے تاکہ اپنا اندرونی حسد، خبث ظاہر کر کے کفار کو اپنے ساتھ رکھ سکے اسکی اس دوہری حرکت کو نفاق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فریب دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور وہ نہیں فریب دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور (سمجھ) نہیں۔ ﴿۲۱﴾

يُخَذُّعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يُخَذُّعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۱﴾

تفسیر

﴿۲۱﴾ اس آیت مبارکہ میں منافقین کی بد عملی دھوکہ دہی اور فریب کاری کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ اپنی دوہری روش منافقانہ چال کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ خدا اور ایمانداروں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں

حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ سمجھ کر دراصل وہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ رہے ہیں انہیں عقل نہیں۔ منافقین نے دھوکہ تو حضور ﷺ کو دیا مگر قرآن مقدس نے اس دھوکے کو اللہ تعالیٰ سے دھوکہ دینے کا ذکر فرمایا۔ اس میں حضور ﷺ کی عظمت کا ذکر ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ دھوکہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کے ساتھ دھوکہ قرار دیا جیسے قرآن مقدس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرمایا من یطع الرسول فقد اطاع اللہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ ایسے ہی یہ ارشاد ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دیا اس نے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیا۔ اگر یہ معنی نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ جل مجدہ جو سب کچھ جانتا ہے اور کوئی شے اس سے مخفی نہیں اسے منافقین دھوکہ کیسے دے سکتے ہیں معنی یہ ہوگا کہ منافقین اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کو کوئی دھوکہ دے ہی نہیں سکتا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ان کے دلوں میں بیماری ہے پس اللہ نے ان کی بیماری بڑھادی اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ ﴿۲۲﴾

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ
مَرَضًا وَكَهَمُ عَذَابُ الْيَمِّ
بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ

تفسیر

﴿۲۲﴾ اس آیہ کریمہ میں انکی بیماری کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ صبح وشام اسلام کے خلاف سازشیں کرنے، فتن و فسادات پھیلانے میں مصروف رہتے۔ اب جو شخص لمحہ بہ لمحہ، قدم بہ قدم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت، عداوت اور بغاوت میں گزارتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسکی اس حالت کو مرض سے تعبیر کیا اور پھر دل کا مرض فرمایا، تمام اعضاء کی بیماریاں نقصان دہ ہیں مگر دل کی بیماری سب سے زیادہ بری ہے۔ اس انداز و

ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی مخالفت و عداوت دل کا گھناؤنا مرض ہے جس کا علاج صرف اور صرف یہی ہے کہ دل کی گہرائیوں سے مانا جائے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ انکی بیماری بڑھنے کا سبب فرمایا گیا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ ایک بہت بڑا مرض ہے جو ایمان کو ایسے کاٹتا ہے جیسے کپڑے کو قینچی۔ اللہ تعالیٰ کی الوہیت و عظمت کے خلاف بولنا، حضور ﷺ کی شان رسالت کی مخالفت کرنا، یہ سب باتیں جھوٹ میں شامل ہیں۔ کسی بھی حقیقت کے خلاف کہنا جھوٹ کہلاتا ہے۔ حضور ﷺ نے منافق کی تین علامات بیان فرمائیں۔ ”خصال المنافق ثلث اذا وعد اخلف اذا ائتمن خان اذا حدث كذب او كما قال ﷺ“ منافق کی تین نشانیاں ہیں ”وعدہ خلافی کرتا ہے، امانت میں خیانت کرتا ہے، ہر لمحہ گفتگو میں جھوٹ بولتا ہے“

اس کا معنی یہ نہیں لیا جائے گا کہ وہ ہر وعدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے، ہمیشہ امانت میں خیانت کرتا ہے ہر لمحہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کا مقصد تو اپنا کام نکالنا ہوتا ہے اگر وہ کام سچ سے نکلتا ہے تو سچ بول دیتا ہے، جھوٹ سے نکلتا ہے تو جھوٹ کہہ دیتا ہے۔ کسی وقت بھی ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی ثابت ہو جائے تو نفاق کی علامت ثابت ہو جائے گی۔ اگر کسی بات سے دو معنی نکلتے ہوں، بولنے والے کی مراد ایک معنی ہونے والا دوسرا معنی مراد لے لے تو یہ جھوٹ نہیں ہوگا کہ کہنے والے کا مفہوم ہی اور تھا جو اس کے ذہن میں تھا۔ جیسے حضرت ابو طلحہ کے صاحبزادے بیمار تھے اور آپ سفر سے واپس آئے تو اپنی اہلیہ ام سلیم سے پوچھا بیٹے کا کیا حال ہے؟ تو ام سلیم نے جواب دیا بچے کو راحت مل گئی ہے آپ نے مراد لی تھی کہ بچہ فوت ہو گیا۔ اور اسے تکلیف سے راحت مل گئی ہے۔ دوسرا معنی یہ تھا وہ صحت یاب ہو چکا ہے، اسے شفا مل گئی ہے۔ بچے کے فوت ہو جانے کی وضاحت ہو جانے پر حضرت ابو طلحہ نے اپنی اہلیہ ام سلیم پر جھوٹ کا الزام نہیں لگایا کہ دونوں معنی تھے ایک حضرت ام سلیم کے ذہن میں تھا دوسرا خیال ابو طلحہ کے۔ اسے ”توریہ“ کہتے ہیں یہ جھوٹ نہیں یا جیسے قرآن مقدس نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قول ارشاد فرمایا قوم نے ابراہیم علیہ السلام کو

اپنے میلے پر جانے کو کہا تو آپ نے جواب میں فرمایا ”انسی سقیم“ میں بیمار ہوں قوم نے سمجھا کہ یہ جسمانی طور پر بیمار ہوں گے۔ خلیل علیہ السلام کا مفہوم یہ تھا کہ وہاں میلے پر بت پرستی، لغویات ہیں ایسے کاموں سے میں روحانی طور پر بیمار ہوں، یہ جھوٹ نہیں تو یہ ہے۔

بغیر تحقیق کے ہر سنی سنائی بات کو کر دینا بھی جھوٹ کی قسم ہے جس کی آج پرواہ نہیں کی جاتی اور اس جرم کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک جھوٹ کو نہ چھوڑ دے۔ اس حدیث شریف کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مسند احمد ص ۶۳ ج ۲ میں نقل کیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور جب اُن سے کہا گیا زمین میں فساد نہ کرو تو انہوں نے کہا ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں، آگاہ ہو جاؤ بے شک وہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں ﴿۲۳﴾

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۚ

تفسیر

﴿۲۳﴾ منافقین کی ایک قبیح حرکت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جب انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرتے ہیں، اُن کا مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنا فساد تھا، جنگ ہوتی، مال و مویشی برباد ہوتے، لوگوں کا قتل عام ہوتا یہ فساد تھا، اسلام کی بغاوت، شریعت سے نافرمانی یہ فساد تھا، اسلامی قواعد و ضوابط سے مذاق و استہزاء یہ فساد تھا، منافقین اپنی اس شرانگیزی کو بھی اچھائی سمجھتے تھے وہ اسلام کی مخالفت کو اصلاح اس لئے کہتے تھے کہ ان کے خیال میں اسلام کے قواعد و ضوابط چونکہ اُن کے آباؤ

اجداد کے نظریات کی تردید کرتے تھے اس لئے ان کی مخالفت کو حق جانتے تھے، آج بھی آپ کسی فساد کو اس کے برے نظریات، بد عقائد سے روکیں تو وہ آپ کو غلط کہے گا، اور اپنے برباد کن نظریات کی تردید نہیں کرے گا بلکہ ان کے بہتر ہونے کے دلائل دے گا، منافقین پر ان کی بیماری نے اس قدر غلبہ کر رکھا ہے، کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھنے لگے ہیں، سیاہی کو سفیدی کہتے ہیں، کسی قسم کی شرم محسوس نہیں کرتے، باطل کو حق ٹھہرانا ان کا وطیرہ بن گیا ہے، جب کسی انسان میں یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ہر گناہ کو نیکی سمجھنے لگ جائے، تو پھر اس کا گمراہی کے گڑھے سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس ارشاد سے پتہ چل رہا ہے کہ کفر ہی دراصل بہت بڑا فتنہ ہے، فساد ہے، گمراہی ہے اور اسلام امن ہے، خیر ہے اور اصلاح ہے۔

منافقین کا یہ انداز بتاتا ہے کہ جو لوگ تمام طبقات میں صلح کلی کی رٹ لگاتے ہیں کہ سارے لوگ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں یہ طریقہ کار مومنانہ نہیں۔ مومنانہ طریقہ کار یہ ہے کہ جھوٹے کو جھوٹا کہا جائے اور سچے کو سچا مانا جائے، اس اصول کو مانتے ہوئے اصلاحی تدابیر پر مصالحت ہو تو حرج نہیں۔

آیہ مبارکہ کے آخری حصہ میں ”آلَا“ کا ذکر ارشاد فرما کر اور لفظ ”إِنْ“ سے تاکید کر کے ان کے فساد ہونے پر مہر ثبت کر دی گئی ہے کہ دراصل فتنہ و فساد وہی ہیں ان کا وجود ہی فتنہ ہے۔ ”المفسدون“ کے ارشاد نے بتا دیا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کا کردار فساد ہی فساد ہے، ایمانداروں کے خلاف گفتگو، ہاتھوں سے مخالفت، زبان درازی، نگاہوں کا غلط انداز، پاؤں کا غلط سمت اٹھنا، دل کا برا سوچنا یہ سب کا سب انہی کا فساد ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں فساد فرمایا کہ انہوں نے دین کو برباد کر دیا اور اپنی دنیا آباد کی، اسلام انسان سے دین و دنیا دونوں کی اچھائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ”ربنا آتسنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة“ (اے اللہ ہمیں دنیا بھی اچھی عطا فرما اور آخرت بھی اچھی عطا فرما)۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد و علی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ
قَالُوا أَنْتُمْ مِمَّنْ آمَنَ السُّفَهَاءُ إِلَّا أَنْتُمْ
هُمْ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۴﴾

جب ان کیلئے کہا گیا کہ ایمان لاؤ جیسے اور
لوگ ایمان لائے تو انہوں نے کہا ہم ایسے
ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے
، خبردار بیوقوف یہی لوگ ہیں مگر انہیں علم
نہیں۔ ﴿۲۴﴾

تفسیر

﴿۲۴﴾ منافقین سے جب یہ کہا گیا کہ تم بھی لوگوں کی طرح ایمان لاؤ، لوگوں سے مراد حضور ﷺ کے
صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مراد سیدنا ابوبکر صدیق،
سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی، سیدنا علی المرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین لئے ہیں۔ اس آیت مقدسہ سے پتہ
چلا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا وجود دین میں زبردست سند ہے۔ اُن کا عمل اہم ہے کہ منافقین کو
صحابہ کی طرح ایمان لانے کا کہا جا رہا ہے، ان کی طرح ایمان لانے میں کسی خاص بات کا ذکر نہیں فرمایا گیا،
پتہ چلتا ہے ان کی زندگی کا ہر لمحہ ملت اسلامیہ کیلئے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان صحابہ کرام سے کسی مرحلہ بھی
یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے انحراف کریں۔ منافقین کا صحابہ کو بیوقوف کہنا ان
کی گمراہی کی واضح دلیل ہے۔ منافقین کا صحابہ پر یہ طنز اور غلط فقرہ کا استعمال بتاتا ہے کہ صحابہ کرام پر طعن و
تشنیع، گالی گلوچ ان کے متعلق غلط نظریات یہ طریقہ زندگی ایمانداروں کا نہیں بلکہ منافقین کا ہے، اُن کے
اس غلط نظریہ کی تردید رب قدوس جل مجدہ خود فرماتا ہے، آگاہ ہو جاؤ وہ خود بے وقوف ہیں لیکن اُنہیں علم
نہیں۔ جہالت اور فساد کے گہرے پردوں نے ان سے علم کو چھین لیا ہے اور وہ اپنی جہالت کو علم سمجھ رہے
ہیں، اس آیت مبارکہ سے پتہ چلتا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کس قدر محبوب

ہیں کہ جب منافقین نے انہیں بے وقوف کہا تو خود رب قدوس جل مجدہ نے انہیں جواب دیا کہ بیوقوف وہی لوگ ہیں۔ صحابہ تو حق و صداقت اور علم و معرفت کے روشن مینار ہیں جن کی زندگی کے مجاہدانہ کارنامے اور ناموس مصطفیٰ ﷺ پر مر مٹنے کے جذبات ہمیشہ ملت اسلامیہ کی راہنمائی کرتے رہیں گے۔ اس آیہ مبارکہ کے آغاز میں منافقین کو ایمان لانے کا کہا گیا ہے۔ ”امنوا“ کہ ایمان لاؤ حالانکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جس کا وہ انکار نہیں کرتے تھے، صفوں میں شامل رہتے تھے۔ قرآن مقدس کا یہ ارشاد بتاتا ہے کہ ایمان ظاہری عبادات کا نام نہیں، ظاہری اقرار کا نام نہیں، ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے، جس سے یہ لوگ محروم تھے ان کے زبانی اقرار نے انہیں مسلمانوں کے غیظ و غضب سے تو بچا لیا مگر دل کے انکار نے اور اندرونی سازشوں نے انہیں جہنم کا ایندھن بنا دیا۔ منافقین کا مسلمانوں کو بیوقوف کہنا ان کے تکبر و غرور اور سرکشی کی علامت ہے جو اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں اور جوابی طور پر انہیں ہی بیوقوف فرمایا گیا اس انداز ارشاد سے یہ بھی پتہ چلا اگر لوگ اللہ کے نیک بندوں کی مخالفت کرتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ ان کی حمایت میں جواب فرماتا ہے اور یہ زبردست انکی حوصلہ افزائی ہے۔

منافقین نے صحابہ کو حقیر جان کر بیوقوف کہا کہ صحابہ غریب تھے یہ مالدار تھے یا اس لئے کہ منافقین اسلام کو غلط سمجھتے تھے اور صحابہ اسی سے وابستہ تھے اور یہی اُن کا سب کچھ تھا اسی بناء پر صحابہ کو بیوقوف کہا، یا اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسلام کے لیے سب کچھ قربان کر دیا تھا، مال و دولت سب کو نظر انداز کر کے اسلام کو سینے سے لگا لیا۔ حاضر دنیا کے آرام و آسائش کو چھوڑ کر جنت کو دلوں میں بسا لیا ہے، یا اس لئے کہا کہ اسلام تو محض ایک ہوا کا جھونکا ہے جو آیا اور گیا اور مسلمانوں نے سب کچھ اس جھونکے کو سمجھ رکھا ہے اور منافقین یہ بھول گئے کہ اسلام رہنے کیلئے آیا ہے جانے کیلئے نہیں، یا اس لئے بیوقوف کہا کہ صحابہ ایک بات پر ڈٹ گئے ہیں ان کا مرنا جینا اسی سے وابستہ ہے اور منافقین نے دوسرا معیار اپنا کر اپنے کو محفوظ کر رکھا ہے۔

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان (مسلمانوں) کے ساتھ صرف مذاق کرتے ہیں ﴿۲۵﴾

وَإِذْ الْقَوَّالِينَ إِنَّمَا قَالُوا آمَنَّا بِكَ وَإِنَّا خَلَوْنَا إِلَىٰ شَيْطَانِنَا قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِؤُونَ ﴿۲۵﴾

تفسیر

﴿۲۵﴾ پہلی آیہ مبارکہ میں منافقین کی مسلمان دشمنی کا اس طرح ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کو بیوقوف کہتے تھے اب اس آیہ کریمہ میں ان کے ایک فریب کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ آیہ مبارکہ عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی۔

ایک بار انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت کو گزرتے دیکھا تو عبد اللہ بن ابی نے اپنے دوستوں سے کہا، دیکھئے میں ان سے کیسے بات کرتا ہوں اور انہیں کس طرح بے خبر بناتا ہوں۔ جب یہ جماعت قریب آئی تو عبد اللہ بن ابی نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور بڑی تعریف کی کہ آپ تو بڑے عظیم انسان ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں، قبیلہ بنی تمیم کے امیر ہیں، ایسے ہی پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے باتیں کرنے لگا کہ عمر آپ بہت بڑے انسان ہیں، حضور پر مال و جان قربان کرنے والے ہیں، ایسے ہی پھر سیدنا علی المرتضیٰ سے کہا آپ بڑے عظیم ہیں حضور ﷺ کے داماد ہیں حضور کے بھائی ہیں، بنی ہاشم کے بہت بڑے سرکردہ ہیں، تو حیدر کرار رضی اللہ عنہ نے فرمایا عبد اللہ چھوڑو ایسی باتیں آپ لوگوں کو خدا سے ڈرنا چاہئے، منافقت اچھی شئی نہیں ہلاکت ہے، تباہی ہے، عبد اللہ نے کہا علی آپ ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں ہم بھی آپ کی طرح ہی ایماندار ہیں۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم

اجمعین کی جماعت چلی گئی تو عبداللہ نے ساتھیوں سے کہا دیکھا میں نے کس طرح ان سے باتیں کیں اور انہیں چکر دیا تو باقی منافقین نے عبداللہ بن ابی کی تعریف کی، اب یہ آیہ کریمہ اُتری۔

جب ایمانداروں سے ملیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان کے ساتھ صرف مذاق کرتے ہیں، منافقین کے اس انداز کو بُرا قرار دیا جا رہا ہے اس ارشاد گرامی سے یہ بھی پتہ چلا کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ استہزاء حرام ہے، کفر ہے یہ بھی پتہ چلا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین انہیں دھوکہ دینے کی کوشش، اُن سے مذاق، ایمانداروں کا شیوہ نہیں، بلکہ دشمنان صحابہ کا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اولیاء کرام سے مذاق تو بہت ہی بُری بات ہے، قرآن مقدس نے تو عام لوگوں سے بھی ایسا کرنے کو منع فرما دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ”لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ“ کوئی قوم دوسری قوم سے مذاق نہ کرے، قرآن مقدس نے منافقین کے اس برے کردار کا ذکر فرما کر ان کے نفاق کو واضح کر دیا کہ اُن کی دوہری چال ہے، ناپسندیدہ اور قبیح حرکت ہے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا اپنے شیطانوں سے ملنے کا یہ معنی ہے کہ جب وہ اپنے ہم خیال ساتھیوں سے ملتے ہیں۔ وہ یہود کے مختلف قبائل تھے جو مختلف مقامات پر اپنی اسلام دشمن سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے، جیسے عبدالدار جہنیہ میں، ابوالسوراء شام میں، ابوبردہ اسلمی بنو اسلم میں، کعب بن اشرف مدینہ منورہ میں۔ شیطانوں سے مراد ہر گمراہ، سرکش بھی ہے۔ وہ کسی بھی گروہ یا علاقہ سے تعلق رکھتا ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی اور انہیں ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں ﴿۲۶﴾

اللَّهُ يُسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ
فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۲۶﴾

تفسیر

﴿۲۶﴾ اس آیہ مبارکہ میں استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے استہزاء کا بدلہ دیتا ہے کہ ان کو ایک مدت تک مہلت دیتا ہے پھر اچانک پکڑ لیتا ہے۔ اعلیٰ حضرت مولانا امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے کنز الایمان شریف میں اس کا ترجمہ بہت خوبصورت انداز میں فرمایا، اللہ اُن سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) آپ نے یہ ترجمہ کر کے بہت سے اشکالات ختم کر دیئے ہیں اس کا یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ منافقین اپنے اس گھناؤنے کردار کی وجہ سے عذاب الہی سے بچ نہ سکیں گے، قیامت کے دن انہیں اس استہزاء کی سزا دی جائے گی اور اُن کی یہ فریب کاری کہ انہوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دے لیا ہے اور مسلمانوں کی گرفت سے بچ گئے ہیں انہیں عذاب الہی سے بچانہ سکے گی، استہزاء کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی تو محض صورت کے لحاظ سے ہوگا، حقیقت میں استہزاء نہیں۔

قرآن مقدس کے ایک اور مقام سے بھی مسئلہ حل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے ”جزاء سیئۃ“ سیئہ برائی کا بدلہ برائی ہے حالانکہ ظلم کی سزا ظلم نہیں بلکہ انصاف ہے مگر اسے بھی ظلم کہا گیا ہے ایسے ہی ہر مذاق کی سزا کو بھی استہزاء کہا گیا ہے۔ ”ویمدھم فی طغیانہم“ کے ارشاد میں منافقین کی اس فتنج حرکت کا جواب ہے کہ وہ مسلمانوں سے کیا استہزاء کریں گے، مسلمانوں کا رب انہیں ذلیل کر رہا ہے، کرتا رہے گا، اُن پر آخرت میں یہ راز کھلے گا کہ ان کا دھوکہ مسلمانوں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکا بلکہ انہیں کیلئے عذاب الہی کا سبب بنا ہے۔

”اللہ یستہزی بہم“ کے ارشاد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے دین کا کام کرنے والوں، ذات الہی کا نام بلند رکھنے والوں پر کئے گئے اعتراضات، الزامات کا جواب خود خدائے قدوس دیتا ہے، مسلمانوں پر استہزاء کرنے والوں کو قدرت نے خود جواب دیا ہے، اللہ انہیں اس استہزاء کی سزا دے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خرید لیا تو ان کی تجارت انہیں نفع بخش نہ ہوئی، اور وہ ہدایت یافتہ بھی نہ تھے۔ ﴿۲۷﴾

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
فَبَارِكَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۲۷﴾

تفسیر

﴿۲۷﴾ اس آیت مبارکہ میں منافقین اور ان کے ساتھیوں کے ایک بُرے کام کا ذکر کیا گیا ہے جسے تجارت اور خرید و فروخت کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہاں پر خرید و فروخت کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو پسند کر کے اختیار کر لیا، حق ان کے سامنے تھا اور واضح تھا، حق کے کمالات وہ دیکھ چکے تھے، اس کی خوبیوں سے واقف ہو چکے تھے مگر پھر بھی کفر کے حواریوں، یہود و نصاریٰ کی راہ کو پسند کیا اور یہ سودا اُن کا ایسا تھا کہ اصل مال بھی برباد کر بیٹھے۔ تجارت کی خوبی تو یہ ہوتی ہے کہ اس میں نفع حاصل ہو اور کسی قسم کے نقصان سے محفوظ رہے، انتہائی بد قسمت تاجر وہ ہوتا ہے جو اس تجارت میں اپنا اصل مال بھی برباد کر بیٹھے۔ ان کی حالت یہی ہے کہ ہدایت قبول کرنے کی صلاحیتیں بھی برباد کر بیٹھے۔ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو ایمان قبول کرنے کے بعد کفر میں چلے گئے، یا اُن یہود کے حق میں جن کا حضور ﷺ کی آمد سے قبل تو آپ پر عقیدہ تھا، آپ کی آمد کا انتظار تھا مگر جب حضور ﷺ تشریف لے آئے، تو انکار کر دیا۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے انسان کو عقل و فکر کی دولت سے نوازا ہے کہ وہ سچ، جھوٹ حق و باطل کا امتیاز کرے اور پہچان کر اپنی زندگی کی گاڑی کو اچھی راہ پر چلائے۔ منافقین نے عقل و فکر کی خداداد نعمت سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ برباد کر دیا، حق کے بدلے میں باطل کو، سچ کی جگہ جھوٹ کو اختیار کر کے برباد ہو گئے۔ یہ تجارت ایسے ہی ہے جیسے کوئی بیوقوف تاجر اصلی گھوڑا دے کر نقلی کھلونا پسند کر لے۔ منافقین کے اندر فطری

ہدایت تو تھی کہ ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے مگر جوان ہونے پر یہ لوگ کسی سے ہدایت حاصل نہ کر سکے کہ اسلامی احکام کو دل سے مانتے اور حضور ﷺ سے دلی طور پر گہری عقیدت رکھتے، اس ہدایت میں ناکامی پر فطری ہدایت بھی انہیں کام نہ دے سکی۔ یہ دونوں ہدایات اکٹھی ہوں تو اسلام کی روح پیدا ہوتی ہے ورنہ محرومی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور جب اس کا ماحول روشن ہو گیا تو اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا وہ دیکھتے نہیں۔ ﴿۲۸﴾ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں وہ ایمان کی طرف نہیں آئیں گے۔ ﴿۲۹﴾

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍۭتٍ لَا يُبْصِرُوْنَ ۚ صُمُّواْ بِكُمْ غُمٍّۭ فهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۚ

تفسیر

﴿۲۸﴾ اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حال کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ منافق جب کلمہ شریف پڑھ کر مسلمانوں میں شمار ہونے لگتا ہے اور مسلمانوں کی گرفت سے بچ جاتا ہے کہ اس نے ظاہری کلمہ پڑھنے و عبادات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہے اور صدقہ، زکوٰۃ سے مفادات حاصل کر لئے ہیں اس کی موت پر بھی مسلمانوں جیسے احکام اُس پر لاگو ہو جاتے ہیں، کفن، دفن، جنازہ اسلامی رنگ ڈھنگ پر ہی ہوتا ہے مگر جو نبی قبر میں گیا وہ ساری ظاہری روشنیاں برباد ہو گئیں اور اس پر اس کے سارے اندھیرے چھا گئے۔

بلکہ اس دنیا میں بھی وہ رسوا ہو گئے کہ ایک موقع پر حضور ﷺ نے انہیں ایک ایک کا نام لے کر مسجد شریف سے نکال دیا تھا۔

قرآن مقدس نے ظلمات کا ارشاد فرما کر اسکے سارے اندھیروں کی طرف اشارہ فرما دیا، کفر کا اندھیرا، نفاق کا اندھیرا، قیامت کے دن کا اندھیرا، ان کے مکرو فریب کا اندھیرا، ان کی سازشوں کا اندھیرا، اللہ کے غضب کا اندھیرا، ان پر ہمیشہ عذاب میں رہنے کا اندھیرا، یہ سب اندھیرے ان پر مسلط ہو جائیں گے۔ (العیاذ باللہ) ان کے برعکس ایمانداروں کا معاملہ مختلف ہوگا کہ ان کا نور، ان کے دائیں بائیں آگے پیچھے ان کا ساتھ دے گا۔ دکھاوے کے طور پر اسلام سے وابستگی کر کے منافقین نے ظاہری طور پر تو آگ روشن کی لیکن جب موت آئی تو وہ آگ اچانک بجھ گئی اور اس آگ کا کوئی ذرہ بھی باقی نہ رہا کہ دوبارہ روشن کر سکیں۔

﴿۲۹﴾ ان کی اس حالت کو اس طرح ذکر فرمایا کہ وہ بہرے ہیں کہ حق بات سنتے ہی نہیں، وہ گونگے ہیں کہ حق بولتے ہی نہیں وہ اندھے ہیں کہ حق دیکھتے ہی نہیں۔ صرف حق کے سلسلہ میں بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، ورنہ باطل کے ساتھ وہ ہر طرح ٹھیک ہیں کہ ہر بری بات کو سنتے ہیں، بری باتیں کہتے ہیں، بُری باتیں دیکھتے ہیں، اس آئیہ مبارکہ کا معنی یہ ہوا کہ اگر کوئی حق سنتا نہیں تو وہ بہرا ہے حق کہتا نہیں تو وہ گونگا ہے، حق دیکھتا نہیں تو وہ اندھا ہے، اگر چہ زبان، کان، آنکھ ہوں۔ جن لوگوں کی یہ حالت ہے وہ ایمان کی طرف نہیں آئیں گے، علماء کا وہ طبقہ جو ہر جگہ چپ سادھے رہتا ہے، خاموش رہتا ہے، برائی کو دیکھ کر رد عمل نہیں کرتا، وہ غور کرے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ
وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَّجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ
فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ
وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝

یا ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو
آسمان سے برسنے والی بارش میں ہوں، اس
بارش میں اندھیرے، کڑک اور بجلی ہو وہ موت
سے ڈر کے مارے اپنی انگلیاں اپنے کانوں
میں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرے
ہوئے ہے ﴿۳۰﴾

تفسیر

﴿۳۰﴾ امام ابن جریر طبری نے اس مقام پر ذکر کیا ہے کہ منافقین کے گروہ سے دو شخص رسول اللہ ﷺ کے
پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے تو انہیں راستہ میں بارش نے آلیا جس کا ذکر اس آیہ مقدسہ میں ہے۔ وہ
بجلی اور کڑک کی وجہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، جب روشنی ہوتی تو چلتے، اندھیرا ہوتا تو رک
جاتے، قرآن مقدس نے ان کی اس حالت کو اس انداز میں ذکر فرمایا۔

منافقین کی حالت کو اس طرح سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی سیاہ اور اندھیری زندگی کا سفر طے کر رہے
ہیں کہ اچانک اُن میں حضور ﷺ جلوہ گر ہو گئے اور آپ پر تیز بارش کی طرح قرآن مقدس اترنا شروع ہو گیا
جس سے دلوں کی زمین میں حسین پودے پھل دار درخت، خوشبودار پھول ہونے لگے مگر اسی قرآن مقدس
میں اسلامی احکام اور حدود کا بھی ذکر آیا جو گرج اور کڑک کی طرح ہے یہ منافقین اسلام کی اس گرج اور
کڑک سے گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں مگر جب کبھی انہیں مفاد ملتا ہے تو چل پڑتے ہیں
اور کہتے ہیں، اسلام سچا ہے، جب کبھی مصیبت وارد ہو گئی تو انکار کر دیا اور دین سے پلٹ گئے، اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے کافر ہمارے قبضہ میں ہیں۔

اس مثال میں مزید وضاحت کیلئے یہ سمجھ لیا جائے، بارش سے مراد اسلام ہے، اندھیروں سے مراد مصائب ہیں، روشنی، بجلی سے مراد اسلامی فتوحات ہیں، جب حق و صداقت کا تیز مینہ برسنا اور پھر مصائب کے بادل بھی گرنے لگے تو منافقین پھسل گئے مگر جودل سے ایمان لائے تھے وہ ثابت قدم رہے، منافقین اسلام کی بارش سے استفادہ چاہتے تھے مگر ظاہری مشکلات و مصائب کو دیکھ کر گھبرا گئے جب اسلام کی ظاہری حالت کو اچھا دیکھتے تو لپک جاتے، جب کوئی پریشانی سامنے آتی تو دودھرا انداز اختیار کر لیتے۔ (العیاذ باللہ) ان کے اسی نفاق کو اس آیہ مبارکہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

قریب ہے بجلی اچک لے ان کی آنکھیں جب چمکتی ہے ان کیلئے تو وہ چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو رک جاتے ہیں مگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت، بصارت لے جاتا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ﴿۳۱﴾

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

تفسیر

﴿۳۱﴾ قرآن مقدس نے منافقین کے حال کو اس آیہ کریمہ میں اور زیادہ وضاحت سے ارشاد فرمایا، اُن کی حالت یہ ہے کہ جب بجلی چمکتی ہے تو روشنی میں کچھ چلتے ہیں، اندھیرا چھا جاتا ہے تو رک جاتے ہیں۔ جب حضور ﷺ کے کمالات و معجزات کو دیکھتے ہیں تو ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ حضور ﷺ کے کھلے کمالات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، اب اس صورت میں وہ کچھ دور تک چلتے ہیں اور پھر جب شیطان انہیں شک و شبہات کے دلدل میں پھنسا دیتا ہے تو ان کے پاؤں وہیں گڑ جاتے ہیں، اطمینان و سکون کی دولت

سے محروم ہو جاتے ہیں اور حیران و سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ اسلام کو مانیں یا انکار کر دیں، یہی تذبذب ان کی بربادی کا سبب بنا اور انہیں منافقین کے زمرہ میں لاکھڑا کیا۔

اسی آیہ مبارکہ کے آخری حصہ میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ کچھ لوگوں کو یہاں پر ٹھوکر لگی، ہر شے پر قادر ہونے کا معنی یہ ہے کہ اُس سے جھوٹ، گناہ، غلطی، برائی بھی سرزد ہو سکتے ہیں (معاذ اللہ) یہ معنی ہرگز نہیں بلکہ معنی یہ ہے وہ ہر اُس شے پر قادر ہے جس کو موجود کرنے کا ارادہ فرمائے اور وہ ان چیزوں کا ارادہ فرماتا ہی نہیں کہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے سبحان اور قدوس ہونے کے خلاف ہیں، لہذا یہ چیزیں صلاحیت ہی نہیں رکھتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تحت آسکیں۔ یہ ایک شیطانی دھوکہ ہے کہ، اگر اللہ کا غلطی کرنا نہ مانا جائے تو وہ قادر کیسے ہوا وہ تو عاجز ہو گیا (معاذ اللہ) یہ نفسانی اور شیطانی فریب ہے۔

عجز تو اس وقت ہوتا جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرتا اور وہ کام نہ ہوتا، وہاں تو ایسا ہوا ہی نہیں کہ یہ تقدیس و تنزیہ کے خلاف تھا، خدا پناہ اگر جھوٹ کو وہاں گنجائش ہو تو ارشاد خداوندی ہے ”ومن اصدق من اللہ حدیثا“ (کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچی بات کہہ سکے) کا مفہوم ہی غلط ہو جائے گا۔ سفیدی، سیاہی، دن رات، سچ جھوٹ، ایک دوسرے کی ضدیں ہیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ جھوٹ، گناہ، غلطی، برائی یہ سب عیب ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کھانے پینے سے پاک ہے اور اس کا نہ کھانا، نہ پینا عجز نہیں، اسی طرح وہ ہر نقص سے، ہر عیب سے پاک ہے اور یہ عجز نہیں کمال ہے، جیسے اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے قدیم ہے اسی طرح اس کی ساری صفات بھی قدیم ہیں، یہ نقائص حادث ہیں۔ قدیم اور حادث اکٹھے نہیں ہو سکتے، لہذا اللہ تعالیٰ ہر عیب، کمی، کمزوری سے پاک ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي
خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ ﴿۱﴾

اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے
تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، اس
امید پر کہ تم پر ہیزگار بن جاؤ۔ ﴿۳۲﴾

تفسیر

﴿۳۲﴾ امام بیہقی اپنی کتاب دلائل النبوة میں سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں جس سورۃ میں ”یا ایہا الناس“ ہو وہ مکی ہے اور جس سورۃ میں ”یا ایہا الذین آمنوا“ ہو وہ مدنی ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں عبادت کا حکم ہر انسان کو ہے جس میں مومن، کافر، منافق سبھی شامل ہیں، مومن کو عبادت کرنے کے حکم کا معنی یہ ہوگا کہ وہ عبادت پر ثابت قدم رہے، منافق کو عبادت کے حکم کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اخلاص کے ساتھ عبادت کر لے اور نفاق کو دل سے نکال دے، کافر کو عبادت کے حکم کا معنی یہ ہوگا کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر عبادت کرے کہ بغیر ایمان کے عبادت کا کوئی معنی باقی نہیں رہ جاتا۔ عبادت کے سلسلہ میں اصل ایمان ہے، وہ پہلے ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں سبھی لوگوں کو عبادت کرنے کا حکم ہے اور دلیل فرمائی جا رہی ہے کہ اُس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ کفار، مشرکین بھی اس کے قائل تھے، کہ ان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ جیسے قرآن مقدس کا دوسری جگہ سورۃ الزخرف میں ارشاد ملتا ہے۔ ”وَلَنَسْأَلَنَّهُمْ مِنْ خَلْقِهِمْ لِيَقُولُنَّ اللَّهُ“ اگر آپ اُن سے سوال کریں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ کسی کو اپنا خالق، اللہ، رب مان کر اس کے حضور عجز و انکساری کا انداز پیدا کرنا، عبادت کہلاتا ہے اگر یہ عقیدہ نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگی بلکہ تعظیم ہوگی۔

لوگوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو کہ وہ تمہارا رب ہے، تمہیں پالنے والا ہے، اور پالنے والے کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، ”ربکم“ کے ارشاد میں یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ

عبادت کی حقدار صرف وہی ذات ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اسے ایک قطرہ سے عظیم انسان بننے تک لے جائے اور یہ شان ربوبیت بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی میں نہیں۔ بت تو خود محتاج ہیں دوسروں کی تربیت کیا کریں گے۔ ”خلقکم“ میں بھی اللہ کے رب ہونے کا ذکر ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا کہ اس کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے تمہارے باپ، دادا کو بھی پیدا کیا، لہذا تم پر دو ہر احکم ہے کہ اس کی عبادت کرو، وہ تمہارا بھی رب ہے تم سے پہلوں کا بھی رب ہے۔

عبادت کا حکم تمہیں اس لئے دیا جا رہا ہے کہ تم متقی بن سکو، یہاں پر تقویٰ کا معنی یہ بھی ہے کہ تم عذاب الہی سے بچ سکو، یہ معنی بھی ہے کہ تمہارے دلوں میں خوف خدا کا نور پیدا ہو جائے، یہ معنی بھی ہوگا کہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو، یہ معنی بھی ہوگا کہ تم عبادت کے ساتھ اپنے ظاہر کو سنوارو کہ تمہارا باطن بھی ٹھیک ہو سکے۔ قرآن مقدس نے اس آیہ مبارکہ میں اللہ کے رب ہونے اور خالق ہونے کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ کے وحدہ لا شریک ہونے کا ذکر فرما دیا ہے۔ جب رب ہونے میں اُس کا کوئی شریک نہیں تو اس کے الہ ہونے میں کوئی کیسے شریک ہو سکتا ہے، خدائے قدوس کے وحدہ لا شریک ہونے میں قرآن مقدس نے کس طرح صاف ستھرا اور حسین انداز اختیار کیا ہے جس کے سامنے بحر زخار لوگ بھی دم بخود نظر آتے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا اور پانی سے تمہارے رزق کیلئے کچھ پھل پیدا کئے لہذا تم اللہ تعالیٰ کیلئے شریک نہ بناؤ۔ جبکہ تم جانتے ہو۔ ﴿۳۳﴾

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ
بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ
بِهِ مِنَ الشَّجَرِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا
لِلدِّينِ آئِدًا ۖ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾

تفسیر

﴿۳۳﴾ اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے انسانوں پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کے ذہن، دل و دماغ اس بات کو مان لیں کہ وہ اپنی ذات میں وحدۃ لا شریک ہے اور بندوں پر اس جیسا کوئی مہربان و رحیم نہیں۔ پہلا انعام یہ فرمایا کہ اُس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنا دیا ہے کہ اُسے سختی اور نرمی کے درمیان رکھا کہ فرش کی طرح ہو جائے اور لوگوں کیلئے اس پر بیٹھنا، لیٹنا آسان ہو۔ دوسرے انعام کا ذکر اس طرح فرمایا کہ آسمان کو تمہارے لئے چھت بنایا، آسمانوں کا وجود اک حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ان کی کیفیت، ماہیت کیا ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

حضور ﷺ کا شب معراج آسمانوں سے گزرنا ایک یقینی امر ہے جس کا انکار گمراہی ہے۔ آسمان کو چھت فرمایا جس سے تمہارے لئے چاند، تارے، سورج کی روشنی بھی آتی ہے۔ تیسرے انعام کا ذکر اس طرح فرمایا کہ اُس آسمان سے تمہارے لئے پانی بھی برسایا۔ چوتھے انعام کا ذکر اس طرح فرمایا کہ اس پانی سے تمہارے لئے ”کچھ“ پھل بھی اُگائے، ”کچھ“ اسلئے فرمایا کہ ہر پھل بارش سے نہیں ہوتا بعض بغیر بارش کے بھی ہوتے ہیں جیسے کھجور۔ یہ معنی بھی ہوگا کہ کچھ پھل تمہارے کھانے کو اور کچھ تمہارے جانوروں کیلئے، رہا یہ کہ زمین سے پیدا ہونے والا رزق صرف انسانوں کیلئے تو نہیں اس سے تو تمام کیڑے مکوڑے، پرند چرند، حشرات الارض سبھی کھاتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان سب کیلئے یہ رزق حضرت انسان کی وجہ سے ہی ہے، اس کی برکت سے ہے اس کے طفیل ہے ان انعامات کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا جا رہا ہے جب یہ ساری حقیقت تم نے معلوم کر لی ہے تو اب عقل، فکر اور وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے اس خالق و مالک کا کوئی شریک نہ بناؤ، اس کے بغیر کسی کیلئے سر بسجود نہ ہو، جس خدا نے تمہیں اس طرح کی بے پناہ شاندار نعمتوں سے نوازا ہے، اس کی بغاوت سے بچو اور دامن وفا کو تھامو، حیرت ہے تم معمولی تنخواہ پر خود اپنے مالک کے وفادار رہتے ہو اور کروڑوں نعمتوں سے نوازنے والے خالق و مالک سے بغاوت کیوں؟ نافرمانی کیوں؟ اطاعت کیوں نہیں؟

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اگر تمہیں اس کتاب کے (کلام الہی ہونے میں) شک ہے جس کو ہم نے اپنے (خاص) بندے پر نازل کیا تو اس کی مانند کوئی اور سورۃ (بنا کر) لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ ﴿۳۳﴾

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

تفسیر

﴿۳۳﴾ اس سے پہلی آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے اپنے خالق و مالک اور وحدہ لا شریک ہونے پر دلائل فرمائے تھے اب اس آیہ مبارکہ میں قرآن مقدس کے کلام الہی ہونے پر دلیل ہے، اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والے عربی لوگوں کو چیلنج کیا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی قسم کا شک ہے کہ قرآن مقدس کلام الہی نہیں تو اس کی مانند کوئی ایک سورۃ بنا کر لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ چنانچہ تمام عرب اس کی مثال لانے سے عاجز رہے۔ کفار کو بدگمانی تھی کہ یہ کلام خدا کا نہیں حضور ﷺ نے خود بنا کر پیش کیا ہے۔

پورے قرآن پاک کی مثل نہ لاسکے تو فرمایا گیا ”فاتوا بعشر سورۃ مثله“ چلو دس سورتیں ہی بنا لاؤ، یہ بھی نہ ہو سکا تو فرمایا ”فاتوا بسورۃ مثله“ ایک سورۃ ہی لے آؤ، جب ایک سورۃ بھی نہ لاسکے تو یہ بھی فرمایا گیا ”فلیاتو بحدیث مثله“ ایک آیت لے آئیں مگر وہ بری طرح ناکام رہے۔ منکرین کیلئے یہ کس قدر آسان طریقہ تھا کہ ایک آیت بنا کر لے آئیں اور اس چیلنج کو صدیاں گزر گئیں جو اب نہ بن سکا قیامت تو آجائے گی مگر اس کا جواب نہ لاسکیں گے۔ یہی دلیل ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ قرآن مقدس کے ہزاروں کمالات میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ مقدس کلام خوشی ہو یا غمی، دکھ ہو یا

سکھ، ہر مقام پر دلی سکون کا باعث بنتا ہے۔ کتنی بھی دلچسپ کتاب ہو اسے ایک دو مرتبہ پڑھنے کے بعد جی اکتا جاتا ہے مگر یہ مقدس کتاب زندگی بھر پڑھتے رہیں جی اکتائے گا نہیں بلکہ ہر مرتبہ ذوق بڑھتا جائے گا یہ بھی کمال ہے کہ چیزوں کو دیکھ کر مانا جاتا ہے مگر اس کتاب میں تاثیر ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو بغیر دیکھے مانا، حشر نشر، جنت دوزخ کو بغیر دیکھے مانا ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں ”علیٰ عبدنا“ کا ذکر ہے کہ ہم نے یہ قرآن اپنے بندے پر اتارا، یہ نہیں فرمایا کہ اپنے رسول پر یا اپنے حبیب پر، معلوم ہوتا ہے بارگاہ قدس میں حضور ﷺ کے مقام عبدیت کو خاصہ درجہ حاصل ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْأَجَارُ ۖ
أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾

پھر اگر نہ کر سکو (اور ہم اعلان کئے دیتے ہیں
کہ) ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے
جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ ﴿۳۲﴾

تفسیر

﴿۳۲﴾ پہلی آیہ مبارکہ میں منکرین کو کھلا چیلنج تھا کہ اگر تم سچے ہو تو قرآن پاک کے مقابلہ میں ایسی کتاب لاؤ، اگر ساری کتاب نہیں تو دس سورتیں ہی بنا لاؤ، دس نہیں تو چلو ایک سورۃ ہی سہی، یہ بھی نہیں تو کم از کم ایک آیت ہی سہی، اب فرمایا جا رہا ہے کہ تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے گویا یہ چیلنج قیامت تک ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ قرآن مقدس کا انکار اللہ تعالیٰ سے کھلی بغاوت ہے اور اس بغاوت کی سزا جہنم ہے اور جہنم کی آگ دوسری آگ سے کہیں زیادہ سخت اور برباد کرنے والی ہے، دوسری آگ تو کٹڑیوں کو جلاتی ہے مگر جہنم کی آگ انسانوں اور پتھروں کو جلا دیتی ہے۔ تم پر ضروری ہے کہ اس سخت آگ سے بچو، اس سے بچنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ قرآن پاک کا انکار چھوڑ کر اس کی حقانیت اور

صداقت کا اقرار کرو، اور آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ۔ قرآن مقدس کا یہ واضح اور کھلا چیلنج بتاتا ہے کہ قرآن مقدس حضور ﷺ کے بے شمار معجزات میں سے ایک ہے۔ معجزہ ہوتا ہی وہ ہے جو عقل کو عاجز کر دے، معجزہ عقل میں نہیں آتا، ایمان میں سماتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کو یہ خوشخبری دیدیں کہ ان کیلئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جب بھی انہیں باغات سے کوئی پھل کھانے کیلئے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا اور انہیں شکل و صورت میں ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے اور ان کیلئے ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۳۵﴾

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
أَن لَّهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
كُتُبًا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ
مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ
وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۵﴾

تفسیر

﴿۳۵﴾ اس سے پہلی آیہ مبارکہ میں کفار کو ڈرایا گیا تھا، اب اس آیہ پاک میں ایمانداروں کو خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ انہیں قیامت کے دن باغات عطا ہوں گے، اس آیہ مبارکہ میں ایمانداروں کیلئے چار انعامات کا ذکر فرمایا گیا ہے (۱) جنت کی خوشخبری (۲) جنت کے پھلوں کی عطا (۳) پاکیزہ بیویوں کا ملنا (۴) ان انعامات کا ہمیشہ نصیب رہنا۔

یہ خوشخبریاں ان لوگوں کیلئے ہیں جو ایمان بھی لائے اور کام بھی اچھے کئے، پہلے ایمان کا ذکر ہے پھر عمل صالح کا۔ معلوم ہوا مرکزیت ایمان کو حاصل ہے، عمل صالح کو نہیں۔ اگر کوئی شخص بغیر ایمان کے اچھے کام کرتا ہے تو اس کیلئے آخرت کے یہ انعام نہیں ہوں گے، بلکہ اس کے ان اچھے کاموں کا صلہ دنیا میں ہی دیدیا جائے گا۔ ایمان ایک مضبوط بنیاد ہے، عمل صالح اس پر چنی گئی عمارت ہے اگر بنیاد مضبوط ہے تو شدید بارش ہو یا سیلاب کا ریلہ، مکان بچ جائے گا، عمارت کمزور بھی تھی تو بچ جائے گی کہ بنیاد مضبوط تھی۔

ایمان اور عمل صالح کے مسئلہ کو یوں ہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایمان کے اندر مرکزیت ہے، حسن ہے، مگر عمل صالح سے بھی اہم شئی ہے۔ آپ کے مکان میں سرو کا پودا ہے جو بہت بھلا اور حسین لگ رہا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک رکتوں، مالٹا یا انار کا پودا ہے، اب باہر سے آنے والا آدمی جسے بھوک ہے پیاس ہے، نیند ہے، وہ اپنے آرام کیلئے سرو کا انتخاب نہیں کرے گا بلکہ انار کے پودے کو ترجیح دے گا، اس کے پھل سے کچھ کھا لے گا، شاخوں کے سایہ میں نیند پوری کرے گا۔ میرے وجود کے مکان میں خوبصورت پودا ایمان کا ہے جو میرے حسن اور اچھائی کا سبب ہے مگر میرے اس پودے سے دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ پودا دنیا اور آخرت میں میرے لئے ہی بہتر ہے، دولت ہے، مگر انار کے پودے سے دوسرا فائدہ اٹھالے گا۔ ایسے ہی میرے عمل صالح سے دوسرا شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، رقم خرچ کر کے مسجد بناتا ہے مگر دوسرا اس میں نماز پڑھ کر فائدہ اٹھا لے گا، اللہ تعالیٰ کو بھی مومن کا عمل صالح ہی اچھا لگتا ہے کہ اُس سے اس کے بندے، اس کی مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔ لفظ جنت پر یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے لفظ ”جن“ کا معنی ہے ڈھانپ لینا۔ جنت کو جنت اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس کی شاخیں زمین کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ ”جنین“ اس بچے کو کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ میں چھپا ہوتا ہے، جن کو جن اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عام نظروں سے چھپا ہوتا ہے، جنت عربی میں ڈھال کو کہتے ہیں کہ اس سے آدمی اپنے آپ کو حملہ آور سے چھپا لیتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں جنت کے حصول کیلئے ایمان اور عمل صالح کا ذکر فرمایا گیا اور قرآن مقدس اکثر

و بیشتر مقامات پر ایمان اور عمل صالح کا ذکر فرماتا ہے مگر اس کے باوجود جنت کے حصول کیلئے اس کے فضل و کرم پر بھروسہ کیا جائے۔ اس آیہ مبارکہ میں پاک، طیب بیویوں کے ملنے کا ذکر ہے وہ خواتین ظاہری، باطنی عیوب سے پاک ہوں گی، پیشاب، پاخانہ، حیض و نفاس، میل گندگی، بداخلاقی، نافرمانی، بدزبانی ایسے برے اعمال سے بھی پاک ہوں گی۔

اس آیہ مبارکہ میں جنات کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے، یہ جنت ان کیلئے تیار ہو چکی ہے، ایسا نہیں کہ قیامت کو بنائی جائے گی، حضور ﷺ نے شب معراج جنت کی سیر کی ہے، حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے ہیں۔ اس آیہ پاک میں جنتی پھلوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، ان کی شکلیں تو دنیاوی پھلوں کی طرح ہوں گی مگر لذت، ذائقہ اور حقیقت بالکل مختلف ہوگی۔ آیہ مبارکہ کے آخری حصہ میں ”خالدون“ سے جنتیوں پر مزید انعام کا ذکر ہے کہ ساری حسین و لازوال نعمتیں دے کر ان سے چھینی کبھی نہیں جائیں گی اور اس دارالامن، دارالسکون جنت سے انہیں کبھی نہیں نکالا جائے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

بے شک اللہ حیا نہیں فرماتا کہ (ہدایت کے سلسلہ میں) کسی بھی مثال کو چھوڑے خواہ وہ چھڑکی مثال ہو یا اس سے بھی کسی حقیر شی کی پس وہ لوگ جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال اللہ کی طرف سے حق ہے، رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس (معمولی) مثال سے اللہ نے کیا ارادہ کیا وہ اس مثال کے بیان سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے، اور وہ صرف فاسقوں کو ہی گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ ﴿۳۶﴾

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

تفسیر

﴿۳۶﴾ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، قرآن مقدس نے منافقین کے سلسلہ میں آگ جلانے اور بارش میں گھرے ہوئے شخص کی مثال بیان فرمائی، حضرت قتادہ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے مکڑی اور مچھر کی مثال بیان کی تو منافقین اور یہود و نصاریٰ نے یہ طعنہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی مثالوں کی کیا ضرورت پڑی تھی وہ تو بڑی عظمت والا رب ہے، تو اس آیہ میں ان کی تردید فرمائی گئی ہے، قرآن مقدس نے بتوں کی حقارت بیان کرنے کیلئے ان کو مکھی اور مکڑی سے تشبیہ دی ہے، سورۃ العنکبوت شریف آیت ۴۱ میں اس طرح ذکر ہے ”جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے مددگار بنائے ان کی مثال مکڑی کی مثال ہے جس نے جالے کا گھر بنایا اور بے شک سب سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا ہے“ اس مثال پر لوگوں نے اعتراض کیا۔ سورۃ الحج شریف آیہ ۷۳ میں اس طرح فرمایا گیا ”اگر مکھی اُن بتوں سے کوئی چیز چھین کر لیجائے تو وہ اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب و مطلوب دونوں کمزور ہیں“ علامہ بدر الدین عینی فرماتے ہیں منافقین کو قرآن مقدس کے اس انداز بیان پر اعتراض تھا تو ان کے رد میں آیات مبارکہ نازل ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ حق واضح کرنے کیلئے کسی بھی مثال دینے سے حیاء نہیں فرماتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف حیا کی نسبت کئی روایات میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً ارشاد ہے اللہ تعالیٰ سفید بالوں سے حیاء فرماتا ہے یا جیسے حدیث شریف میں حضرت انس فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا جو بوڑھا شخص صحیح عمل کرتا ہو اللہ تعالیٰ کو اس سے حیاء آتی ہے کہ وہ سوال کرے اور اللہ اس کو نہ دے۔ (جامع الاحادیث)

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے کہ وہ حیاء نہیں فرماتا، یہاں پر حیاء سے مراد وہ عام معنی نہیں ہے جو بندوں میں پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ معنی محال ہے یہاں معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ حق کو واضح کرنے کیلئے کسی حقیر سے حقیر شے کی مثال کو چھوڑتا نہیں اور اس میں کئی حکمتیں ہوتی ہیں۔

کفار و مشرکین کا اعتراض تھا کہ ان معمولی چیزوں کی مثال دینے سے فائدہ کیا تو جواب دیا گیا کہ یہ مثال کفر و ایمان کی کسوٹی ہے جس سے مومن اور کافر کی پہچان ہوگی۔ کفار اس مثال کے بیان کرنے پر کئی قسم کے شک و شبہات میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئے اور بہت سے لوگ اپنے رب کے ارشادات اور مثالوں کو دل کی گہرائیوں سے مان کر ہدایت پا جاتے ہیں اور بہت سے لوگ ہدایت پر قائم ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگوں کی ہدایت مزید پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

جو اللہ تعالیٰ سے پکا عہد کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ
مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ
يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ
هُمْ الْخٰسِرُونَ ﴿۳۷﴾

﴿۳۷﴾

تفسیر

﴿۳۷﴾ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فاسقوں کی ایک اور خرابی کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کئے گئے مضبوط عہد کو توڑتے ہیں۔ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے لیا تھا، جس کا ذکر قرآن مقدس نے سورۃ الاعراف آیہ (۱۷۲) میں اس طرح فرمایا ہے ”اور یاد کیجئے جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پٹیھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا، فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم نے گواہی دی“ جس کا ذکر قرآن مقدس نے اس طرح فرمایا ہے۔

”واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتاب لتبيننه للناس“ (ال عمران)

اور یاد کرو جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ تم یہ عہد لوگوں سے ضرور بیان کرو گے منافقین کے ایک اور شر کو اسی آیہ پاک میں اس طرح فرمایا گیا کہ انہیں حکم تھا کہ رشتہ داروں سے تعلق جوڑیں وہ توڑتے ہیں، اللہ کا حکم تھا کہ محبت کریں وہ اعراض کرتے ہیں، اللہ کا حکم تھا کہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائیں، فرق نہ کریں وہ ہر اچھے کام کو چھوڑ کر فتنے کی طرف بڑھتے ہیں، فساد پھیلاتے ہیں۔ فساد یہ تھا کہ لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے تھے، آیات الہیہ کا مذاق اڑاتے تھے، اس آیہ مبارکہ سے واضح ہے، رشتہ داروں، اعزاء، اقرباء سے قطع تعلق کو قرآن مقدس نے کفار کی عادات میں ذکر کیا ہے، رشتہ داروں سے قطع تعلق کے مفہوم کو عام سمجھا جائے تو تمام طرح کے تعلقات اس میں آجاتے ہیں، جسمانی، روحانی تمام تعلقات کو نبھانے کا حکم ہے اور توڑنے کی مذمت ہے۔ تعلقات کو نبھانے کا معنی یہ ہے کہ ان کے حقوق ادا کئے جائیں، توڑنے کا یہ معنی ہوگا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کیا جائے اور نبھایا نہ جائے۔ اس آیہ مبارکہ میں چار قبیح جرائم کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے ہر انسان کو بچنا چاہئے وہ یہ ہیں (۱) خدا کی اطاعت نہ کرنا (۲) عہد کو توڑنا (۳) حقوق ادا نہ کرنا (۴) زمین میں فساد پھیلانا۔ اس آیہ مبارکہ میں ميثاق کو توڑنے کی مذمت ہے جس سے پتہ چلا وعدہ کے توڑنے سے زیادہ برا ميثاق کا توڑنا ہے۔ ميثاق مضبوط، پختہ وعدہ کے معنی میں ہوگا وہ سرسری وعدہ نہیں بلکہ اس پر گواہ ہیں اس میں مضبوطی ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں صلہ رحمی کی اہمیت اور قطع رحمی کی مذمت واضح طور پر فرمائی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ قطع رحمی کے وبال سے بچائے اور آپس میں صلہ رحمی کی نعمت سے نوازے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ
اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم
مردہ تھے اُس نے تم کو زندہ کیا وہ پھر تم پر موت
طاری کرے گا پھر تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس
کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ﴿۳۸﴾

تفسیر

کفار و مشرکین کو فرمایا جا رہا ہے تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کر سکتے ہو۔ تم ذرا اپنی حالت کو تو دیکھو، تم تو
مردہ تھے پانی کے ایک قطرہ سے تمہاری تخلیق ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جسم دیا پھر روح پھونکی اور زندہ
فرمایا پھر جب تمہاری مدت حیات پوری ہو جائے گی وہ پھر تم پر موت طاری کرے گا وہ پھر تمہیں زندہ کرے
گا پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور قیامت کے دن جزا، سزا کا عمل مکمل ہوگا۔

اس آیہ مبارکہ سے موت کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ موت ایک حالت کا نام ہے جیسے یہاں
(کنتم امواتا) سے معلوم ہو رہا ہے جیسے نطفہ کی حالت کو موت سے تعبیر فرمایا گیا ہے (فاحیاءکم) پھر
میری جسمانی حالت کو حیات سے تعبیر فرمایا گیا (ثم یمیتکم) سے میری زندگی کے خاتمہ کی طرف اشارہ
ہے (ثم یحییکم) موت کے بعد زندگی سے مراد قبر کی زندگی ہے، یا قیامت کے قریب زندہ کر کے اٹھانا
مراد ہے، پہلا معنی قبر کی زندگی زیادہ سمجھ میں آتا ہے کہ موت کے بعد فوراً قبر میں زندگی دی جاتی ہے اور اس
سے سوالات و جوابات ہوتے ہیں، ان سوالات و جوابات کے بعد صاحب قبر کی موت کا ذکر کہیں نہیں ملتا
بلکہ مومن کیلئے یہ الفاظ ملتے ہیں ”نم کنوۃ العروس“ (دلہن کی طرح آرام سے سو جا) سو جانا اور ہے،
مر جانا اور ہے۔

اور حضور ﷺ کا فرمانا کہ جب تم قبرستان سے گزرو تو اہل قبور سے ”السلام علیکم“ کہو یہ ارشاد بھی

اسی حیات کی تائید کرتا ہے، میت کا قدموں کی آواز کو سننا، سوالات و جوابات کا ہونا، یہ سارے دلائل حیات برزخ کی تائید کرتے ہیں اس آئیہ مبارکہ میں انسان کی کئی حالتوں کا ذکر ہے۔ پہلی حالت موت کا، پھر ماں کے پیٹ میں حیات کا، پھر ماں کے پیٹ سے باہر کی حیات کا، پھر موت کا، پھر قبر کی حیات کا یا حشر کی حیات کا۔

یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جب وہ تمہارے اندر ایسی حیران کن تبدیلیاں لاسکتا ہے اور لاتا ہے تو پھر اسے قیامت کے دن تمہیں اٹھا کر تمہارا حساب و کتاب لینے میں کیا مشکل ہوگی، تم اس کی ذات کا انکار نہیں کر سکتے۔ یہ دلیل ہٹ دھرم کافروں کو سمجھانے کیلئے دی گئی ہے کہ سمجھو جو اللہ تمہارے اندر انقلابات لانے پر قادر ہے وہ تمہارے دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

(اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے فائدے کیلئے زمین میں سب کچھ پیدا کیا پھر آسمان کی طرف ارادہ فرمایا تو اُس نے سات ہموار آسمان بنا دیئے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿۳۹﴾

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ
سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

تفسیر

﴿۳۹﴾ پہلی آئیہ مبارکہ میں ہماری حیات کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے پر عظیم نعمت ہے۔ اس آئیہ پاک میں حیات کی کامیابی کا ذکر ہے کہ زندگی کی بقاء کیلئے زمین کی نعمتوں سے استفادہ ضروری ہے اس آئیہ مبارکہ میں اس نظریہ کی بھی تردید ہو رہی ہے کہ دنیا کی چیزیں خود بخود وجود میں آگئیں۔ فرمایا جا رہا ہے ان سب کا خالق اللہ ہے، اُسی نے پیدا فرمائیں، آئیہ مبارکہ کا انداز واضح کرتا ہے کہ کائنات کی ہر شے انسان کیلئے ہے۔ اب اسے ہی سوچنا چاہئے کہ یہ کس کیلئے ہے، اس سوال کا جواب قرآن مقدس

کے دوسرے ارشاد میں اس طرح ملتا ہے ”ہم نے جنوں اور انسانوں کو اسلئے پیدا کیا کہ عبادت کریں“ کائنات کی تخلیق کا مقصد انسان کا فائدہ ہے، انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ چیزیں زمین پر ہوں یا زمین کے نیچے، انسانی فائدہ کیلئے ہی ہیں۔ آسمانوں کو ایسا برابر فرمایا کہ اُن میں کہیں سوراخ، شکاف یا ٹیڑھا پن نہیں۔ آسمانوں کی تعداد کا سات ہونا بھی اس آیہ سے واضح ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں بندوں پر اس انعام کا بھی ذکر ہے کہ تمہیں پیدا کر کے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ تمہارے لئے ہزاروں نعمتیں پیدا فرمادیں، یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آسمانوں کا سات بنانا اور پھر برابر بنانا بھی ہمارے فائدے کیلئے ہی ہے، ہاں جن چیزوں کو شریعت مطہرہ نے حرام قرار دیدیا اُن سے بچنا ضروری ہو گیا، آیہ مبارکہ کے آخری حصہ میں علم الہی کا ذکر ہے، کفار کا نظریہ تھا کہ مرنے کے بعد جی اٹھنا محال ہے۔ بندہ مر گیا اس کے اعضاء بکھر گئے، دنیا کے مختلف حصوں میں اڑ گئے۔ اب انسان دوبارہ پیدا کیسے ہوگا؟ تو آخری حصہ میں جواب دیا گیا کہ بکھرے اعضاء کا اکٹھا کرنا اس کیلئے مشکل ہے جسے پتہ نہ ہو کہ وہ اعضاء کہاں ہیں۔ بکھرے اعضاء کو اکٹھا کر کے زندگی بخشا اللہ تعالیٰ کیلئے مشکل نہیں کہ وہ ہر شے کو جانتا ہے ”خلق لکم“ کا ارشاد ہے کہ زمین کا سب کچھ تمہارے لئے ہے اس سے علماء نے دلیل بنائی ہے کہ احکام میں اصل اباحت ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ
فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا
مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي
أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

اور یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں
سے فرمایا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا
ہوں، فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص کو نائب
بنائے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا
حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں
اور پاکیزگی بیان کرتے ہیں، فرمایا بے شک
میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں
جانتے۔ ﴿۴۰﴾

تفسیر

﴿۴۰﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں انسانی عظمت کا ذکر تھا کہ کائنات کی ہر شئی انسان کیلئے ہے، آیہ
پاک میں انسانی عظمت کی دلیل یہ فرمائی گئی کہ کائنات میں وہ ممتاز اس لئے ہے کہ اللہ نے اسے اپنا نائب
بنایا ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں ان کے بارے میں قرآن مقدس اس طرح ارشاد فرماتا ہے۔
”لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ“ (التحریم) وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں
جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے، دوسری جگہ پر ان کی حالت کو اس طرح فرمایا گیا ہے ”يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ
وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ“ (الانبياء) وہ رات اور دن اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔

فرشتے نہایت حیران کن کارنامے سرانجام دیتے ہیں وہ اس نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ کے
کارکن ہیں یہ مختلف خدمات انجام دیتے ہیں، ایک گروہ کا ذکر ”وَالسَّازِغَاتُ غَرَقًا“ میں ہے جو کافر کی
جان سختی سے کھینچتے ہیں اور مومن کی جان نرمی سے۔ ایک گروہ کا ذکر سورۃ الذاریات میں ملتا ہے

”فالمقسمات امرا“ یہ کام تقسیم کرنے والے ہیں۔ ایک گروہ کا ذکر سورۃ الزخرف میں اس طرح ملتا ہے ”ورسلنا لہم یکتبون“ اور ہمارے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں، ان کی تعداد کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے جیسے ارشاد ہے ”وما یعلم جنود ربک الا هو“ یعنی آپ کے رب تعالیٰ کے لشکر (کی تعداد) کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ تمام فرشتے اللہ کے تابع فرمان ہیں۔ معراج کی رات حضور ﷺ نے ایک مقام پر فرشتوں کی قطاریں دیکھیں تو جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کہاں جا رہے ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کی! حضور مجھے خبر نہیں میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں اسی طرح ہی دیکھ رہا ہوں (روح البیان)۔

یہ فرشتے معصوم ہیں مگر نبی کی عصمت کا مقام ان سے بہت ہی آگے ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں مگر نبی اللہ کی صفات کا بھی مظہر ہے اور ذات کا بھی۔ فرشتوں کا ایک حصہ آسمان پر ہے اور دوسرا حصہ زمین پر، ہر ایک گروہ اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا ہے، یہ نوری اجسام ہیں مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام دربار رسالت میں کئی مختلف شکلوں میں حاضر ہوئے ہیں۔ کبھی دھیہ کلیبی کی شکل ہے تو کبھی عام سائل کی، کبھی صدیق اکبر کی شکل میں حاضری ہے تو کبھی فوجی انداز میں حاضر ہیں۔ فرشتوں کے بارہ میں مزید معلومات کیلئے اس فقیر کی کتاب ”جلوۃ جاناں (حصہ چہارم) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

فرشتے عام لوگوں کی نگاہوں سے چھپے ہوئے ہیں مگر ان نورانی اجسام کو اہل اللہ، اولیاء کاملین دیکھ بھی سکتے ہیں۔ کسی شے کے نظر نہ آنے سے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، جن لوگوں نے بعض تاویلات سے فرشتوں کے وجود کا انکار کیا ہے وہ قطعاً غلط ہے، بعض لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا، بعض نے معبود تک مان لیا یہ سارے لوگ حق کی راہ سے بھٹک گئے اور گمراہ ہو گئے۔

خلیفہ

اس آیہ مبارکہ میں آدم علیہ السلام کو زمین میں خلیفہ بنانے کا ذکر ہے، جس سے پتہ چلتا ہے آدم علیہ السلام کا جنت میں قیام سفر طے کرنے کی ایک منزل ہے۔ اس سے بعض جاہل لوگوں کے غلط اعتراض کا

بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو گندم کا دانہ کھانے کی پاداش میں بطور سزا دنیا پر بھیجا گیا (معاذ اللہ) محض غلط اعتراض ہے۔ ان کی تخلیق و خلافت تو ہے ہی زمین والوں کی اصلاح کیلئے۔ یہ بھی یاد رہے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلاء ہو گئے کہ اللہ کو خلیفہ بنانے کی ضرورت تھی محتاجی تھی، خدا اپنا ہا! ایسا ہرگز نہیں بلکہ خلیفہ کی ضرورت بندوں کو تھی کہ وہ اس خلیفہ کے ذریعہ سے اپنے رب قدوس کے ہاں قرب حاصل کر سکیں۔ اس کے احکام سے آگاہ ہو سکیں، نافرمانی سے بچ سکیں، جنت کے حقدار ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس خلیفہ کو نبی اور رسول کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے یہ خلیفہ فرشتوں سے کہیں زیادہ باہمت ہے، کہیں زیادہ طاقتور ہے جس مقام تک فرشتہ پر بھی نہیں مار سکتا یہ نبی، یہ رسول اس سے بھی کہیں زیادہ آگے ہے۔ فرشتے کی ہمت سے باہر ہے کہ رب قدوس سے بلا حجاب بات کر لے مگر ہمارے رسول پاک ﷺ نے معراج کی رات بلا حجاب بات کر کے واضح کر دیا کہ نبی فرشتے سے بہت آگے ہے۔

اس آئیہ مبارکہ میں جو فرشتوں سے فرمایا گیا ہے کہ میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہ کوئی مشورہ نہیں بلکہ اس خلیفہ کی خبر دی ہے کہ فرشتے اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور پھر انہیں اس کی حکمتیں بتادی جائیں۔ فرشتوں کا عرض کرنا کہ یہ خون ریزی کرے گا اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہیں۔ اولاد آدم کی مخالفت بھی نہیں، ان پر تنقید بھی نہیں کہ یہ ساری چیزیں جرائم ہیں اور فرشتے جرائم سے پاک ہیں۔ اظہار تعجب ہے کہ فرشتوں جیسی اہم مخلوق کو چھوڑ کر ایسی مخلوق کا انتخاب کیا جا رہا ہے جس سے فتنہ و فساد کا ظہور ہوگا، فرشتے روئے زمین پر جنوں کا فساد دیکھ چکے تھے، اسی پر انسانوں کو بھی قیاس کر لیا یا اس بناء پر کہ فرشتوں نے عصمت کو اپنے لئے خاص سمجھ کر باقی سب کیلئے خطا کا ذکر کر دیا، فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم تسبیح و تقدیس کرنے والے ہیں یہ ان کی طرف سے تکبر نہیں خود پسندی نہیں بلکہ اپنے پرانعام الہیہ کا ذکر ہے اور انسان کی مخفی قوتوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی مخفی قوتوں پر یہ فرما کر خاموش کر دیا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے تمام انبیاء علیہم السلام کی ذوات قدسیہ انسان کی صورت میں زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلفاء ہیں۔ انسان کو خلیفہ

کیلئے منتخب کرنے سے معلوم ہو گیا، اسے جنوں اور فرشتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کا علم سب پر محیط ہے، یہ علم و فضل، فہم و ادراک اور روحانیت کا وہ عظیم پہاڑ ہے جس کی بلندیوں کو چھونے سے جن اور فرشتے عاجز ہیں، اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خدائی میں بے پناہ تصرفات سے نواز رکھا ہے اس کے یہ سارے کمالات بتاتے ہیں کہ خلافت کا حقدار یہی تھا۔ یہی وہ ذرہ ہے جسے کائنات نے امام مانا، یہی وہ قطرہ ہے جس کی عظمتوں کے سامنے شدید موسلا دھار بارشیں اور سمندروں، دریاؤں کی گہرائیاں دم بخود ہیں، جو زمین کا سینہ چیر دیتا ہے اور سمندروں کا رخ موڑ دیتا ہے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اسی موضوع پر مزید دلچسپی مقصود ہو تو صاحب روح البیان علامہ اسماعیل حقی علیہ الرحمہ کا انداز بیان اسی مقام پر ملاحظہ فرمانے سے ذہن میں بالیدگی، روح میں تازگی پیدا ہوگی۔ خلیفہ کی ساری عظمتوں کو سمیٹنے کیلئے یہی ایک فقرہ کافی ہے کہ

”وہ کائنات میں خدا کا نائب ہے“

اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نائب کسی مجبوری، کمزوری کے باعث نہیں بنایا بلکہ اسے عظمتوں سے نوازنا مقصود تھا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر ان چیزوں کو فرشتوں پر پیش کر کے فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ ﴿۴۱﴾

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ
هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴۱﴾

تفسیر

﴿۴۱﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں آدم علیہ السلام کے خلیفہ بنانے کا ذکر تھا اب اُن کے علم کا ذکر ہے کہ خلیفہ کیلئے علم کا وسیع ہونا بھی ضروری ہے نیز اس آیہ میں فرشتوں کے سوال کا ایک مثبت پہلو میں جواب

بھی فرمایا گیا ہے کہ خلافت کا حقدار وہی ہوگا جس کا علم تم سے زیادہ ہوگا۔ اس ارشاد میں آدم علیہ السلام کی علمی ہیبت بھی نمایاں ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ مال اور دولت کی فراوانی میں وہ اعزاز نہیں جو علم و فضل میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ہر ایک چھوٹی بڑی شے کے نام سکھادیئے۔ صاحب روح البیان علامہ اسماعیل حقی نے اسی مقام پر فرمایا آدم علیہ السلام کو ۷ لاکھ زبانوں کا علم تھا بے شک آدم علیہ السلام کا علم بہت ہے (مگر حضور ﷺ کا علم پاک ان سے کہیں زیادہ ہے) ”و علمک مالہ تکن تعلم“ کا ارشاد واضح دلیل ہے محبوب تجھے ہر وہ شے سکھادی جسے تو نہ جانتا تھا (اور آدم علیہ السلام ایک ہزار پیشوں میں ماہر تھے، مگر آپ نے کھیتی باڑی کا انتخاب فرمایا۔ روح البیان نے اسی مقام پر انبیاء علیہم السلام کے پیشوں کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اور اس عظیم مقام کا تقاضا بھی یہی تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں آدم کو آدم اس لئے کہا گیا کہ انہیں ادیم الارض (زمین کی سطح) سے بنایا گیا۔ سرخ، سیاہ، سفید مٹی سے تخلیق فرمائی گئی۔ اسی وجہ سے انسانوں کے رنگ مختلف ہیں۔ آدم علیہ السلام کو چیزوں کے صرف نام ہی نہیں سکھائے گئے تھے بلکہ ان کی حقیقتیں، خاصیتیں ان کا طریق استعمال، اُن کے متعلقہ سارے معاملات بتادئے، سکھادئے۔ وہی اثر ہے کہ آج انسان حقائق اشیاء کی تہہ تک پہنچنے میں کس قدر ترقی کر رہا ہے۔ ﴿اس آیت مبارکہ کے تحت مفسرین کرام نے علم کی فضیلت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس عنوان پر تفسیر کبیر، تفسیر عزیزی کا مطالعہ مفید رہے گا۔﴾

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فرشتوں نے عرض کی، تو پاک ہے، ہمیں صرف انہیں چیزوں کا علم ہے جن کی تو نے ہمیں تعلیم دی، بے شک تو ہی سب جاننے والا ہے، حکمت والا ہے۔ ﴿۴۲﴾

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾

تفسیر

﴿۴۲﴾ کچھلی آیہ مبارکہ میں فرشتوں سے فرمایا گیا تھا اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ اس آیہ پاک میں فرشتوں کی طرف سے جواب ہے۔ فرشتوں کے اس جواب میں ان کی عاجزی کا ذکر ہے، فرشتوں نے جواب سے پہلے اللہ کی پاکیزگی کا ذکر کیا ہے جس سے درس ملتا ہے کہ اللہ کی تقدیس و تحمید کس قدر اہم ہے۔ اسی آیہ مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ جس مسئلہ کا پتہ نہ ہو اس پر بحث کی بجائے اپنے علم کی کوتاہی کا ذکر کر لینا ہی بہتر ہے، فرشتوں نے بحث نہیں کی بلکہ اپنی کوتاہی کا ذکر کیا ہے، اس میں فرمایا گیا ہے یوں تو سب کچھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے مگر علم کی عطا کی نسبت خصوصاً اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ فرشتوں نے کہا یا اللہ جو کچھ تو نے ہمیں سکھایا ہے بس وہی جانتے ہیں، یہ بھی پتہ چلا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر لاکھوں نعمتیں ہیں مگر سب سے افضل و اعلیٰ نعمت وہ علم ہے جس سے خدا کی معرفت نصیب ہو۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں علم و حکمت عظیم صفات ہیں جن کا ذکر فرشتوں نے کیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فرمایا اے آدم ان کو ان سب چیزوں کے نام بتاؤ، جب آدم نے ان سب چیزوں کے نام انہیں بتا دیئے تو فرمایا کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا میں ہی آسمانوں اور زمین کا غیب جاننے والا ہوں اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔ ﴿۴۳﴾

قَالَ يَا آدَمُ اسْمُهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا
أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ
إِنِّي أَعْلَمُ الْغَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۴۳﴾

تفسیر

﴿۲۳﴾ جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے علم کی کمی اور کمزوری کا واضح اظہار کر دیا کہ ہمیں پتہ نہیں صرف وہی جانتے ہیں جو کچھ تو نے سکھایا تو اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدم علیہ السلام کو حکم ملا کہ آدم! (علیہ السلام) تم انہیں ہر شئی کے نام بتاؤ، اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا دیا کہ میں آدم کو صرف اختیار دے کر ہی دنیا میں نہیں بھیج رہا بلکہ علم بھی دے رہا ہوں کہ کام کرنے کیلئے علم بھی ضروری ہے۔ اس کا کام تو دنیا کی اصلاح تھا، فرشتوں کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جو اندیشہ تمہیں تھا وہ فساد کرے گا، خونیازی کرے گا، تمہارا وہ اندیشہ غلط ہے کہ اسے علم بھی دے رہا ہوں اور اس کا یہ علمی پہلو اس کے فساد پر حاوی ہوگا۔ اگرچہ اس میں فساد کی خرابی بھی ہوگی مگر وہ بہت چھوٹی ہوگی اور اصلاح کی خوبی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہوگی۔ جب آدم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آدم تم ان چیزوں کے نام بتاؤ تو انہوں نے فوراً سب کچھ بتا دیا، اس سے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کا مزید علم ہو گیا، فرشتوں کو یہ علم اور خدائے ذوالجلال کی معرفت آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے ملی۔

یہاں یہ واضح ہو رہا ہے کہ فرشتوں کو نبی کے علمی مقام سے روشناس کرایا جا رہا ہے، جس سے وہ دم بخود ہیں، یہاں پر یہ بھی واضح ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سامنے اس کی عظیم علمی صفت کے ذریعہ سے بلند و بالا فرمادیا، حالانکہ صفات تو اور بھی تھیں مگر انبیاء علیہم السلام کے اندر صرف علم خصوصی طور پر دکھائی دیتی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ
فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ابَىٰ وَاسْتَكْبَرَ
وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝

جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا آدم کو سجدہ کرو تو
ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اُس نے انکار
کیا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔ ﴿۲۴﴾

تفسیر

﴿۲۴﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں آدم علیہ السلام کی علمی فضیلت اور فرشتوں کے اعتراف کا ذکر تھا۔
سب نے تسلیم کیا کہ آدم علیہ السلام سب سے زیادہ عالم ہیں۔ اب تمام فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ ”آدم کو سجدہ
کرو“ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے جھک جانے کا حکم دیا گیا یہ ان کی تعظیم کیلئے تھا۔ اگر اس سے
مراد سجدہ شرعی ہے تو معنی ہوگا کہ آدم علیہ السلام کی عزت و عظمت کیلئے انہیں قبلہ کا درجہ دیا گیا، سجدہ دراصل
اللہ تعالیٰ کیلئے ہی تھا اگر اس سجدہ سے مراد لغوی سجدہ ہے تو پھر یہ سجدہ تعظیمی ہے جیسے یوسف علیہ السلام کے
بھائیوں نے ان کی تعظیم کیلئے انہیں سجدہ کیا تھا۔ اس معنی میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کا
احترام کریں۔ اگر کوئی کسی کو خدا سمجھ کر سجدہ کرتا ہے تو یہ عبادت ہوگی اور عبادت صرف اور صرف اللہ کیلئے ہی
ہے اسے سجدہ تعبیدی کہتے ہیں اور اسلام نے خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کیلئے عبادت کو حرام قرار دیدیا
ہے۔ اگر سجدہ کسی کی تعظیم کیلئے ہے تو سجدہ تعظیمی کہلائے گا جیسے پہلی شریعتوں میں تھا مگر ہماری شریعت مطہرہ
میں سجدہ تعظیمی کو بھی حرام قرار دیدیا گیا۔

کسی بزرگ یا والدین کیلئے صرف کندھے جھکا دینا سجدہ نہیں بقدر رکوع جھکنے سے بچے۔ اگر یہ
سوال کیا جائے کہ آیہ کریمہ میں لازم ہے۔ اگر آدم علیہ السلام کو محض قبلہ کی حیثیت دینا ہوتا تو ”الی آدم
“ہوتا، تو جواب دیا جاسکتا ہے کہ ”لا آدم“ میں بھی تعظیمی پہلو ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ”قوموا
لسیدکم“ اپنے سردار کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔ اگر یہ قیام تعظیمی ہو سکتا ہے تو وہ سجدہ تعظیمی کیوں نہیں متصور

ہوسکتا۔ یہ سجدہ تعبدی ہرگز نہیں، کہنے والوں کا محض خیال ہے۔ سجدہ تو پیشانی اور ناک کو بغرض عبادت زمین پر رکھنے کا نام ہے۔

ابلیس نے انکار کر کے تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔ یہ تکبر زبردستی بُرائی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا ”جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا“۔ دوسرے کو حقیر جاننا، اپنے کو بڑا سمجھنا تکبر ہے۔ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو اپنے سے کم سمجھا اور کہا اے اللہ! تو نے مجھے آگ سے بنایا، آدم کو مٹی سے، اس لئے میں اس سے افضل ہوں۔ تکبر کی وجہ یہ بنی کہ اس نے ہزاروں سال عبادت کی تھی، دوسری وجہ یہ بھی بنی کہ اس نے سمجھا کہ اس کی خدمات زیادہ ہیں۔

تکبر عز ازیل را خوار کرد بزندان لعنت گرفتار کرد

تکبر نے عز ازیل کو ذلیل کر دیا اور وہ ہمیشہ کیلئے لعنت کے قید خانہ میں قیدی بن گیا۔ اچھا، صاف ستھرا، پاکیزہ لباس پہننا تکبر نہیں ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کی حضور ایک شخص اچھا لباس، اچھا جوتا پہننا پسند کرتا ہے تو فرمایا ”اللہ جمیل و یحب الجمال“ اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور ہم نے فرمایا آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس جنت میں سے جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ زیادتی کرنے والوں میں شمار ہو جاؤ گے۔ ﴿۴۵﴾

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا
هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۴۵﴾

تفسیر

﴿۴۵﴾ آدم علیہ السلام کو جب تاج خلافت پہنا دیا گیا اور فرشتوں سے تعظیم کروادی گئی تو اب انہیں حکم دیا گیا کہ آدم تو اور تیری بیوی جنت میں ٹھہرو، وہاں سے جو چاہو کھاؤ، سیر و سیاحت کرو مگر گندم یا انجیر یا انگور کے پاس نہ جانا ورنہ زیادتی کرنے والوں میں ہو جاؤ گے، (ان درختوں کا ذکر مختلف روایات میں ہے قرآن مقدس نے کسی درخت کا نام ذکر نہیں فرمایا) آدم علیہ السلام کی تخلیق تو زمین کیلئے ہی ہوئی ہے جیسے ارشاد ہے (جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ) زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ مگر کچھ دن جنت میں ٹھہرا کر دنیا میں ہونے والے معاملات و حالات سے نبھاؤ، امر و نواہی سے آگاہی وغیرہ ایسے بے شمار واقعات کی تربیت مطلوب ہے۔

اس صورت حال میں آزمائش بھی تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں کس حد تک حکم کی پابندی کرتے ہیں، اس امتحان کیلئے جنت کا انتخاب کرنے میں بھی حکمت ہے کہ انسانوں کو بتا دیا جائے کہ تمہارے قیام کیلئے جنت ہی بہتر مقام ہے مگر شیطان کے مقابلہ میں مار کھا جاؤ گے تو اس عظیم قیام گاہ سے محروم ہو جاؤ گے۔ رہا یہ کہ آدم و حوا علیہما السلام درخت کے قریب چلے گئے تو ظالموں میں شمار ہو گئے۔ نہیں ہر گز نہیں، گناہ یہ ہے کہ حکم خداوندی کی خلاف ورزی قصداً کی جائے۔ جو کام بھول سے ہو گیا، وہ گناہ نہیں قرآن مقدس فرماتا ہے ”وَلَقَدْ عٰہَدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسِیَہٗ فَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عِزْمًا“ (طہ) اور بے شک اس سے پہلے ہم نے آدم سے عہد لیا تھا (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائیں) پس وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا ارادہ نہ پایا، جب آدم علیہ السلام نے بھول کر کھا لیا تو نہ ان سے گناہ ہوا نہ ہی وہ ظالموں میں شمار ہوئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِينٍ

پس شیطان نے انہیں جنت سے لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں نکال دیا، ہم نے فرمایا تم (سب) نیچے اترو تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت مقررہ تک ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے۔ ﴿۲۶﴾

تفسیر

﴿۲۶﴾ فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا، آدم علیہ السلام کے علمی مقام کا واضح ہونا، فرشتوں کا اپنی کم علمی پر اعتراف کرنا، یہ آدم علیہ السلام کیلئے عظیم سرفرازی تھی۔ شیطان کو یہ ساری عظمتیں پسند نہ آئیں اور حسد میں مبتلا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طرح سے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال سکے۔ اس وقت تک شیطان کے جنت میں آنے جانے پر پابندی نہ تھی۔

شیطان آدم علیہ السلام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور نہایت مکاری سے گفتگو شروع کی کہ مجھ سے آپ کے حق میں گستاخی ہو گئی ہے جس کے سبب ملعون ہو گیا ہوں، اب اس کا کفارہ چاہتا ہوں۔ آدم آپ اپنی اس عظمت پر نازاں نہ ہوں آخر تو موت ہی ہے، میں آپ کو ایسے درخت کا پتہ بتاتا ہوں اگر آپ کھالیں تو موت نہیں آئے گی، آدم علیہ السلام سے اُس درخت کا ذکر کیا جس کے قریب جانے سے روک دیا گیا تھا اور دونوں کو قسمیں اٹھا کر یقین دلایا کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے، چنانچہ حضرت حوا نے پہلے وہ پھل یا دانہ کھایا پھر آدم علیہ السلام کو کھلایا، اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے جسموں سے جنتی لباس جاتا رہا اور درختوں کے پتوں سے اپنے جسموں کو چھپانے لگے، اسی حالت میں رب کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ انہیں زمین پر

اُتار دو، چنانچہ آدم علیہ السلام کو سرانديپ ميں اور حضرت حوا کو جدہ ميں اتار ديا گيا۔

آدم عليہ السلام کے اس واقعہ سے یہ شبہ ذہن ميں آتا ہے کہ انبياء عليہم السلام سے بھی گناہ سرزد ہوتے ہيں؟ اس کا جواب پچھلي آيہ کریمہ کی تفسير ميں ديديا گيا کہ گناہ ہوتا ہے کہ ”ارادہ اور قصد سے رب کی نافرمانی کرے“ اور آدم عليہ السلام اس سلسلہ ميں بھول گئے تھے اور بھول سے کام کرنے ميں گناہ نہيں۔ انبياء عليہم السلام کے بارہ ميں ملت اسلاميہ کا عقيدہ ہے کہ انبياء عليہم السلام تمام صغيرہ، کبيرہ گناہوں سے پاک ہوتے ہيں۔

نبی کی اتباع واجب ہوتی ہے اگر اُس سے بھی گناہ سرزد ہوں تو گناہوں کا کرنا بھی لازم ہوگا (معاذ اللہ) انبياء عليہم السلام کے معصوم ہونے کے عنوان پر مزيد معلومات مطلوب ہوں تو ميرے رسالہ ”عصمت انبياء عليہم السلام“ کا مطالعہ مفيد رہے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سيدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے تو اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کی بے شک وہ ہے بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم فرمانے والا۔ ﴿۴۷﴾

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۴۷﴾

تفسير

﴿۴۷﴾ آدم عليہ السلام جب جنت سے زمين پر تشریف لائے تو اپنی بھول پر سخت پچھتاوا ہوا، پریشانی ميں مبتلا ہو گئے، جنت سے علیحدگی، حضرت حوا عنہا السلام سے جدائی، دنیا کے مصائب ایسے اُمڈ آئے کہ مسلسل تین سو سال تک روتے رہے، تفسیر عزیزی ميں ہے کہ حضرت جبریل عليہ السلام کو بھی ان کی

حالت پر رونا آگیا اور انہوں نے بھی بارگاہ قدس میں ان پر رحم کی درخواست کی، آخر قدرت کا کرم ہوا، دریاء رحمت جوش میں آیا، انہیں کچھ کلمات سکھائے گئے، قرآن مقدس میں ان کلمات کا ذکر اس طرح ہے۔ ”ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخسرين“ یہ دعا تھی مگر تفسیر عزیزی، روح البیان نے ایک روایت نقل کی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام جب شدید پریشان ہوئے تو یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیدائش کے وقت عرش پر لکھا پڑھا تھا ”لا اله الا الله محمد رسول الله“ یہ تذکرہ ذہن میں آئی کہ انہیں کے وسیلے سے دعا مانگوں چنانچہ عرض کی ”اسئلك بحق محمد ان تغفر لي“۔ میں محمد (ﷺ) کے وسیلے سے درخواست کرتا ہوں کہ تو میری لغزش معاف فرما۔ ابن منذر کی روایت میں یہ کلمات ہیں ”اللهم اني اسئلك بجاه محمد عبدك ان تغفر لي خطيئتي“ اے اللہ تجھے تیرے بندے محمد (ﷺ) کے وسیلے سے درخواست کرتا ہوں، میری خطا معاف فرما دے، بارگاہ سے حکم ہوا آدم تو نے انہیں کیسے پہچانا؟ عرض کی یا اللہ! میں نے عرش پر تیرے نام کے ساتھ ان کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا تو جان لیا کہ یہ بندہ تجھے بہت محبوب ہے، حکم ہوا میں نے تجھے بخش دیا، فرمایا آدم یہ تیری اولاد میں سب نبیوں کے آخر میں اور ان کی امت تیری اولاد کی امتوں میں سے آخری امت ہے اگر وہ نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ (بتیان بحوالہ محم صغیر) توبہ کا معنی رجوع کرنے کا ہے، بندے کی توبہ یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے رجوع کرے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کا لفظ منسوب ہو تو معنی ہوگا وہ اس بندے کو سزا دینے کی طرف رجوع فرمائے یا بندے کے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور آخرت میں اسے سزا نہ دے۔ سزا سے معافی کی طرف رجوع فرمائے۔ توبہ کے یہ دو پہلو ہا ہم ہیں گزشتہ پر شرمندگی اور طلب معافی، آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد۔ توبہ میں خلوص ہو تو قبولیت میں دیر نہیں لگتی۔

حضور ﷺ نے فرمایا ”التائب من الذنب كمن لا ذنب له“ گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں، بندہ خطا کا رہے اور خطا کاروں میں

سب سے اچھا توبہ کرنے والا ہے۔ مگر جب حقوق العباد میں کوتاہیاں کی ہیں، قرض واپس نہیں دیا، کسی پر ظلم کیا۔ تو قبولیت کیلئے ظلم کی معافی، قرض کی ادائیگی اہم شرط ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ
 قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَاَمَّا يٰٓاٰدَمُ فَكُم مِّنۡ هٰٓذٰی فَاَخَوۡفْ
 مِّنۡ نِّمۡیۡ هٰٓذِیۡ فَمَنۡ تَبِعَ هٰٓذِیۡ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا هُمۡ یَحْزَنُوۡنَ
 ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی اتباع کی تو نہ انہیں کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۲۸﴾

تفسیر

﴿۲۸﴾ پہلی آیہ مبارکہ میں آدم علیہ السلام کے زمین پر اترنے کا ذکر ہے، دراصل یہ عمل انسانوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم فضل ہے۔ نبی کا قوم کو مل جانا بہت بڑا کرم ہے۔ جس سے عابد کو معبود سے ربط ملا، قرب نصیب ہوا، اب پھر زمین پر احکام الہیہ کا آنا مزید کرم ہے، جنت سے باہر آنے کے بعد ہدایت کا ذکر ہے کہ اب اولادِ آدم کا جنت میں جانا ہدایت یافتہ ہونے کے بعد ہے۔

پہلی آیہ پاک میں بھی اترنے کا ذکر ہے، اب پھر دوبارہ اترنے کا حکم ہے یہ تاکید ہے تکرار نہیں۔ پہلا حکم توبہ سے پہلے تھا اور یہ قبول توبہ کے بعد ہے۔ دوبارہ حکم میں ارشاد ہے، آدم اگرچہ توبہ تو قبول ہو گئی مگر جنت سے اترنا ہوگا کہ تمہیں اصل میں زمین کی خلافت ہی کیلئے پیدا کیا گیا تھا۔ اصلی قیام گاہ جنت نہ تھی، جن لوگوں نے سمجھا آدم علیہ السلام کو سزا کے طور پر زمین پر بھیجا گیا غلط سمجھا، ان کی تخلیق کا تو مقصد ہی زمین پر آنا تھا، آدم علیہ السلام کے گندم کھانے کے عمل کو گناہ کہنے والے خود تو یقیناً گناہ گار ہو گئے، مگر آدم علیہ السلام تو محفوظ ہیں، معصوم ہیں۔

آدم، حوا علیہما السلام کو فرمایا جا رہا ہے اب جنت سے جاؤ، زمین پر قیام کرو ہماری طرف سے ہدایت آئے گی اس پر عمل پیرا ہونا، جو ہدایت کی اتباع کرے گا اُسے کسی قسم کا غم نہ ہوگا۔ اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے، انسانی زندگی کا مقصد ہدایت پر عمل کرنا، اعمال صالحہ کا اپنانا ہے۔ نیکی انسان کیلئے اس قدر بہتر مقوی غذا ہے کہ اس کے استعمال کے بعد انسان ہر خوف و غم سے آزاد ہو جاتا ہے، صرف دنیا کے خوف و غم سے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے آخرت میں بھی اُسے کسی قسم کا خوف و غم نہ ہوگا۔ یہ صفت اولیاء اللہ کی ہے جو انہیں نصیب ہوگی، انہیں ایسا خوف نہیں ہوگا جو نقصان دے، مضر ہو مطلقاً اللہ تعالیٰ کا خوف تو بندے کیلئے عظیم نعمت ہے۔ یہاں پر ”علیہم“ سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ ”علی“ ضرر کیلئے آتا ہے، اور اللہ کا خوف تو بہت بڑا نفع ہے، خزانہ ہے، کرم ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۴۹﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ﴿۴۹﴾

تفسیر

﴿۴۹﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں ہدایت پر عمل کرنے کا صلہ فرمایا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کو کسی قسم کا غم خوف نہیں۔ اس آیہ پاک میں ہدایت کے منکرین، انبیاء علیہم السلام کے باغی، دین کے سرکش لوگوں کی سزا کا ذکر ہے کہ ایسے بدکردار لوگ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ کفر کیلئے یہ نہیں کہ وہ ساری آیات کا انکار کرے، سارے احکام نہ مانے تو ہی کافر ہوگا، نہیں اگر قرآن مقدس کی کسی ایک آیہ کا بھی انکار کیا تو کافر ہو گیا۔ ”کفر“ عربی میں گاڑی کے ٹائر کو بھی کہتے ہیں کہ اُس نے ٹیوب کو چھپا رکھا ہے، کافر کو بھی اس لئے

کافر کہا جاتا ہے کہ اس نے حق و صداقت کو چھپا رکھا ہے، کافر کو بھی کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی مہک دوسری خوشبوؤں کو چھپالیتی ہے، کفر انکار کے معنی میں بھی آتا ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا انکار کر رہا ہے، آ یہ پاک میں کفر اور جھوٹ کو ایک ساتھ بیان کیا ہے جس سے دونوں کا مہلک ہونا، بُرا ہونا واضح ہوتا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ جہنم میں جانے کیلئے کفر اور جھوٹ دونوں ہوں گے تو جہنمی ہوگا، نہیں اگر ایک شی بھی ہوگئی تو جہنم کا سامان ہو گیا، جیسے منافق جہنمی ہے حالانکہ زبان سے اسلام کا اقرار کرتا ہے نیز وہ لوگ جو کافر تو نہیں مگر جھوٹ بولتے ہیں وہ سوچیں کہ کفر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اللہ محفوظ رکھے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اے اولاد یعقوب میرے اُس احسان کو یاد
کرو جو میں نے تم پر کیا اور تم میرا عہد پورا کرو
میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور تم مجھ سے ہی
ڈرو۔ ﴿۵۰﴾

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ
اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوا بِعَهْدِیْ
اَوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِیَّیْ فَاَرْهَبُوْنَ ﴿۵۰﴾

تفسیر

﴿۵۰﴾ اس سے پہلے اسلام کی دعوت عام تھی، کفار اور جھوٹوں کیلئے جہنم کا ذکر تھا، اس آ یہ مبارکہ میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اولاد کی اصلاح کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو جنہیں یہود کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے یہی بنی اسرائیل ہی ہیں، چونکہ یہ قوم یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہود سے ہے، اس لئے یہودی کہلائی۔ یہود کو خصوصی طور پر یہاں مخاطب کیا گیا ہے کہ یہ لوگ تعداد میں بھی کافی تھے۔ ان میں علم بھی تھا، علاقہ میں معزز بھی تھے، ان کے ایمان کے بدلے دوسرے بہت سے لوگ ایمان لا سکتے تھے کچھ لوگوں نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ اگر یہود ایمان لے آئیں تو وہ بھی ان کی اتباع میں ایمان لے آئیں گے۔

یہود کو متنبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو امن و عافیت کے انعامات سے نوازے جاتے رہو گے ورنہ اللہ تمہاری جگہ کسی اور کو لے آئے گا جس سے اپنی رضا کے مطابق اپنے دین کی حفاظت کروالے گا۔

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، اس کا معنی ہے ”اللہ کا بندہ“ (عبداللہ) تفسیر عزیزی نے اس لقب عطا ہونے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ حضرت یعقوب اپنے والد حضرت اسحاق علیہما السلام کے بے حد خدمت گزار تھے، وہ عبادت میں مصروف ہوتے تو کسی کو اندر نہ جانے دیتے۔ ایک دن فرشتہ آیا، اس نے اندر جانے کی کوشش کی، آپ نے روک دیا حضرت اسحاق یہ شور سن کر باہر آئے تو یعقوب سے فرمایا بیٹے یہ فرشتہ ہے، فرشتے نے یعقوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی اور فرمایا ہماری طرف سے اس کا نام اسرائیل رکھو، اسی وجہ سے یہ لوگ بنی اسرائیل کہلائے۔ نام کی بہ نسبت لقب زیادہ مشہور ہوا کہ فرشتے نے دیا تھا۔ بنی اسرائیل پر جو احسانات ہوئے وہ بہت ہیں، چار ہزار سال تک یہ لوگ علم کا مرکز بنے رہے۔ ان میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے، روحانی دولت کے امین رہے، آل فرعون سے نجات ملی، من و سلویٰ نازل ہوا، پتھر سے چشمے بہہ گئے، انہیں یہ نعمتیں یاد دلائی جا رہی ہیں، انہیں جو عہد یاد دلایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی نہیں کریں گے، حضور ﷺ پر ایمان لائیں گے، یہ عہد تم پورا کرو، قیامت کے دن جنت میں بھیجے گا عہد میں پورا کروں گا، ان لوگوں کا یہ شرف ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ یہود کو ان پر کئے گئے انعامات یاد دلانے جا رہے ہیں کہ وہ خدا اور مصطفیٰ ﷺ کی نافرمانی سے حیا کریں، یہود کا خدا سے ایک عہد یہ بھی تھا کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان لائیں گے۔

اسی آیہ مبارکہ سے یہ بھی واضح ہے، عہد کا پورا کرنا واجب ہے اور عہد کو توڑنا حرام ہے۔ حضور ﷺ نے عہد توڑنے والوں کے متعلق فرمایا کہ قیامت کے دن انہیں سزا دی جائے گی ان پر بطور نشانی ایک جھنڈا لگا دیا جائے گا جس سے وہ نادم اور شرمندہ ہوں گے، جتنی بڑی عہد شکنی ہوگی اتنا ہی بڑا جھنڈا ہوگا (العیاذ باللہ) و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد و علیٰ آلہ و صحبہ بعدد خلقہ

اور اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاؤ جو میں
نے اتاری ہے جو اس کتاب کی تائید کرتی ہے
جو تمہارے پاس ہے اور تم سب سے پہلے اس
کے منکر نہ ہو اور تھوڑی قیمت کے بدلہ میں
میری آیات کو فروخت نہ کرو اور مجھ سے ہی
ڈرو۔ ﴿۵۱﴾

وَأْمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ
وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي
ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِنِّي فَاتِكُونُ ﴿۵۱﴾

تفسیر

﴿۵۱﴾ کچھلی آیہ مبارکہ میں یہود کو وفادار بننے کا ذکر تھا، عہد پورا کرنے کا ذکر تھا، اب ایمان
لانے اور برائی سے بچنے کا ارشاد ہے۔ یہود کے متعلق جس قدر احکام تھے اُن سب میں مرکزی حیثیت
ایمان کی ہے، باقی سارے تابع ہیں۔ پہلا حکم تھا قرآن پر ایمان لاؤ، وہ تمہارے پاس کی شی (توراة) کی
تصدیق کرتا ہے۔ دوسرا حکم ہے کہ تم سب سے پہلے گمراہ نہ بننا کہ ایمان نہ لاؤ اور قرآن کا انکار کر دو۔ تیسرا
حکم ہے کہ میری آیات کو بیچنے اور اپنا کام نکالنے سے بچو۔ چوتھا حکم ہے مجھ سے ڈرو۔

آیات بیچنے کا معنی یہ ہے کہ کسی کو خوش کرنے کیلئے اور اُس سے اپنا مطلب نکالنے کیلئے آیت کا
ترجمہ غلط کر دیا، مفہوم بگاڑ دیا۔ کعب بن اشرف یہودیوں کا سردار تھا وہ انہیں ورغلا یا کرتا تھا کہ تم تورات
میں وہ آیات جو حضور ﷺ کے متعلق بشارت ہیں ان کا جواب دو تو تمہیں انعام دیا جائے گا، چنانچہ اس کے
کہنے پر یہود علماء نے تورات کی ان آیات کا غلط معنی کیا، مفہوم بگاڑا اور کعب بن اشرف سے انعام وصول
کئے۔ ”ولا تشتروا“ سے اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ تھوڑی قیمت میں آیات نہ بیچنے کا معنی یہ نہ لیا
جائے کہ زیادہ قیمت وصول کر لی جائے تو جائز ہے۔ ساری دنیا کے خزانے بھی ہو جائیں تو یہ قیمت تھوڑی

ہی ہے آیات بیچنے کا مفہوم یہ ہے کہ مفاد اٹھا کر شرعی احکام میں تبدیلی نہ کی جائے۔ دینی کتابوں کی تجارت، دینی خدمات انجام دینے پر وقت کی اجرت، اپنی درسگاہوں اور دینی مراکز میں ملازمت، ایسے امور اس ضمن میں نہیں آتے کہ خلافت راشدہ میں بھی بیت المال سے وظائف دیے جاتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے ”قل متاع الدنيا قليل“ فرما دیجئے دنیا کا سامان جس قدر بھی ہو آخرت کے مقابلہ میں تھوڑا ہے، دین بگاڑ کر دنیا کا فائدہ حاصل کرنا علماء یہود کا کام تھا۔ دین اسلام کے خدمت گزاروں کو یہود کی برائیوں سے بہت دور رہنا چاہئے۔ ”اول کافر بہ“ سے واضح ہے جو شخص پہلے کفر کرے گا بعد میں آنے والے کفار کا گناہ بھی اس کے سر ہوگا۔ کفر بہر حال کفر ہے پہلے ہو یا بعد میں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ ﴿۵۲﴾ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ ﴿۵۳﴾

وَلَا تَلْسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ
وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۖ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا
الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ۝

تفسیر

﴿۵۲﴾ اس آیہ مبارکہ میں حق بات کو غلط باتوں سے ملا کر اس طرح پیش کرنا کہ مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے، حرام ہے۔ اس طرح کسی کے خوف یا طمع سے حق کو ظاہر نہ کرنا بھی حرام ہے اور ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہہ دینا عظیم جہاد ہے۔ بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہہ دینا ہے۔ اسی ارشاد میں حق بات کو چھپانے کی مذمت ہے۔ جابر حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنے کے ہزاروں واقعات تاریخ میں درج ہیں امام قرطبی نے ابو حازم تابعی کا واقعہ نقل کیا ہے۔ وقت کے خلیفہ سلیمان مدینہ منورہ

آئے تو انہیں ابو حازم ملنے نہ جاسکے، سلیمان نے بلایا کہ ایسا کیوں کیا؟ تفصیلی مکالمہ ہے، سلیمان نے پوچھا کلام کونسا اچھا ہے؟ ابو حازم فرماتے ہیں جس شخص سے خوف ہو اس کے سامنے حق بات کہہ دی جائے اور کسی طرح کی رورعائیت نہ ہو۔ ابو حازم تابعی کی حاکم وقت کے سامنے حق گوئی، حق کو چھپانے سے پرہیز کی ایک شاندار دستاویز ہے۔

﴿۵۳﴾ حق کو باطل کے ساتھ ملانے اور حق کو چھپانے کی ممانعت کے بعد پہلا حکم فرمایا جا رہا ہے نماز قائم کرو۔ قرآن مقدس میں سوائے ایک دو مقامات کے جہاں بھی نماز کا حکم دیا گیا ہے، اقامت کے ساتھ ہی ہے کہ صرف ایک دو مرتبہ پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ اس پر ہمیشگی ضروری ہے۔ ”اقامت صلوٰۃ“ کا یہ معنی ہے کہ نماز کو اسکے وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرے، نماز کے فرائض، واجبات اور شرائط کا خاص خیال کرے۔ اگر نماز اپنے اصول و ضوابط اور فرائض و واجبات کے ساتھ ادا ہوتی رہے گی تو آدمی کو برائی اور بے حیائی سے بھی روکتی رہے گی۔

دوسرا حکم دیا جا رہا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرو، زکوٰۃ کا معنی پاک کرنا بھی ہے اور بڑھنا بھی۔ معلوم ہوا شریعت کے اصولوں کے مطابق اپنے مال سے چالیسواں حصہ اللہ کی راہ میں ادا کرنے سے مال پاک بھی ہو جاتا ہے اور بڑھتا بھی ہے۔

تیسرا حکم دیا جا رہا ہے کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو یعنی نماز باجماعت ادا کرو، نماز باجماعت ادا کرنے کے بارہ میں بہت سے ارشادات نبوی ﷺ ملتے ہیں۔ ابو داؤد شریف کی حدیث میں ہے ”لا صلوٰۃ لجماع المسجد الا فی المسجد“ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد ہی میں جائز ہے۔ اسی ابو داؤد شریف میں روایت ہے کہ ایک نابینا صحابی نے حضور ﷺ سے درخواست کی، حضور میں نابینا ہوں، مسجد پہنچانے والا کوئی نہیں نماز گھر پڑھ لیا کروں؟ تو فرمایا پڑھ لیا کرو، جب وہ جانے لگا تو پھر بلا کر فرمایا تاؤ اذان سنتے ہو؟ اس نے عرض کی جی ہاں، تو فرمایا پھر تجھے مسجد میں آنا چاہئے یا فرمایا

(ابوداؤد شریف)

تیرے لئے گنجائش اور رخصت نہیں پاتا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اَنۡ اَمُرُّوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنۡسَوْنَ اَنۡفُسَکُمْ
وَ اَنْتُمْ تَتَلَوۡنَ الْکِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوۡنَ ﴿۵۴﴾

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ
کو بھول جاتے ہو اور تم کتاب پڑھتے ہو تم
عقل کیوں نہیں کرتے۔ ﴿۵۴﴾

تفسیر

﴿۵۴﴾ اس آیہ مبارکہ میں بنی اسرائیل کو ان کی ایک بری حرکت سے روکا جا رہا ہے، ان کا کام
تھا کہ لوگوں کو اچھی بات کہتے اور خود عمل نہ کرتے۔ ان کی اس برائی پر انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے۔ یہودی
علماء سے ان کے مسلمان رشتہ داروں نے پوچھا، اسلام کیسا دین ہے؟ تو انہوں نے کہا اسلام اچھا دین ہے،
تمہیں اس پر قائم رہنا چاہئے تو یہ حکم نازل ہوا کہ، لوگوں کو ہدایت کرتے ہو خود عمل نہیں کرتے۔ اس آیہ
پاک کا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہود حضور ﷺ کی آمد سے قبل لوگوں کو آپ کی آمد کا ذکر کرتے، اطاعت کا حکم دیتے
جب حضور ﷺ تشریف لائے تو خود حسد کرنے لگے اور کافر ہو گئے۔ لوگوں کو اچھائی کا حکم دینا اور خود نہ کرنا
یہود کا وطیرہ تھا، جس سے بچنا ضروری ہے۔ خدا پناہ اگر یہی انداز تبلیغ مسلمان مبلغ میں پیدا ہو جائے تو اس
بد عملی کا مرتکب ہو کر جہنمی ہو جائے گا۔ بے عمل مبلغ، واعظ، خطیب کیلئے یہ ارشاد باعث عبرت ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، معراج کی رات میرا گزر کچھ
لوگوں پر ہوا جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے، میں نے جبریل سے پوچھا یہ کون
لوگ ہیں؟ جبریل نے بتایا کہ آپ کی امت کے دنیا دار واعظ ہیں، خطیب ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم
کرتے تھے مگر خود عمل نہیں کرتے تھے۔ ابن عساکر نے روایت کی، کہ بعض جنتی لوگ بعض جہنمیوں سے

پوچھیں گے تم دوزخ میں کیسے آ گئے، حالانکہ ہم نے تو تم سے سن کر عمل کیا اور جنت میں ہیں، دوزخی کہیں گے ہم زبان سے کہتے ضرور تھے مگر عمل نہیں کرتے تھے، یہی برائی ہمیں لے ڈوبی اور آج دوزخ میں جل رہے ہیں (العیاذ باللہ)

اس حکم کا یہ معنی نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل آدمی دوسرے کو نصیحت نہیں کر سکتا بلکہ معنی یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے۔ اگرچہ بے عمل ہونا تو واعظ اور غیر واعظ دونوں کیلئے جرم ہے، مگر واعظ زیادہ مجرم ہے کہ وہ واعظ ہو کر جرم کر رہا ہے اور وہ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے اس برے کردار کا مالک ہے، جبکہ غیر واعظ اپنی جہالت کے سبب یہ کر رہا ہے اس کے پاس کسی حد تک عذر ہے کہ اسے پتہ نہ تھا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف فرمائے گا، اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ
 وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا
 لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ
 يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ
 إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝
 صبر اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو اور بے شک
 نماز ضرور دشوار ہے مگر وہ لوگ جو اللہ کی طرف جھکنے
 والے ہیں (ان پر نہیں)۔ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ
 وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ
 اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (یہاں پر ظن بمعنی
 یقین ہے) ﴿۵۶﴾

تفسیر

﴿۵۶﴾ گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو روکا گیا ہے کہ وہ حق کے ساتھ باطل نہ ملائیں، جھوٹ موٹ

سے کام نہ لیں، حق کو نہ چھپائیں، نماز باجماعت ادا کریں، زکوٰۃ دیں، اپنے رے دین سے الگ تھلگ ہو جائیں، چونکہ یہ ساری باتیں بڑی اہم ہیں، ان کی باقاعدگی بہت بڑا اہم مسئلہ ہے، تو اس آیہ مبارکہ میں انہیں فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے مشکل کاموں پر قابو پانے کیلئے انہیں وظیفہ یا علاج بتایا جا رہا ہے کہ وہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ ان مشکل کاموں میں آسانی ہو جائے گی، عام مشہور تو یہی ہے کہ مصیبتوں میں صبر کیا جائے۔ صبر کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: صبر علی الطاعة اطاعت پر صبر، اللہ کی بندگی شروع کی ہے تو اس پر ڈٹ کر رہے، جم کر ادا کرتا رہے، دکھ ہو یا سکھ، امن ہو یا ڈر، خدا کی عبادت پر کاربند رہے۔

دوسری قسم: صبر عن المعصية گناہوں سے صبر، نفس چاہتا ہے فلاں گناہ کرے، کوئی پوچھنے والا نہیں، دیکھنے والا نہیں، مگر ایسے موقع پر گناہ نہ کرنا صبر عن المعصية ہے۔

تیسری قسم: صبر علی المصائب مشکلات و مصائب پر صبر کرنا، کامل و مکمل صبر یہی ہے کہ تینوں صورتیں اپنائی جائیں۔ نماز میں بھی صبر ہے کہ مشقت ہے، وقت لگتا ہے، کچھ تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے، یا اس کا معنی یہ ہے کہ ہر مصیبت میں نماز پڑھو، قحط سالی ہے تو نماز استسقاء پڑھو، کوئی پریشانی ہے تو نماز حاجت پڑھو اور اللہ سے دعا مانگو، اپنی اصلاح کیلئے زندگی کو بہتر بنانے کیلئے صبر اور نماز دونوں بہترین عمل ہیں۔

اسی مقام پر تفسیر عزیزی نے ایک شاندار بات نقل کی ہے حدیث شریف میں ہے علم مسلمان کا دوست ہے، حوصلہ اس کا وزیر ہے، عقل راہنما ہے، عاجزی اس کا بھائی ہے اور صبر اس سارے لشکر کا جرنیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور مقبول بندوں اور عاجزی کرنے والوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ، وہ ہیں جو اپنے رب کی طرف لوٹنے اور اس کی ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔ جب بندہ اس مضبوط عقیدہ کے ساتھ اپنے رب قدوس کی بارگاہ کی طرف بڑھتا ہے تو پھر اس راہ کی تمام دشواریاں، مشکلات، مصائب دور ہو جاتی ہیں اور یہ بندہ اپنی منزل مراد کو پالیتا ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں خاشعین کا ذکر ہے وہ کون ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جنہیں قلبی سکون حاصل ہے، عجز و انکساری حاصل ہے، اُن کے دلوں میں اللہ کی عظمت جاگزیں ہے، جب یہ حالت حاصل ہو جائے تو اطاعت آسان ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم خلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں خشوع یہ ہے کہ ہر امیر، غریب، کمزور، توانا، شریف، رزیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو۔ فرائض کی ادائیگی کرو، اللہ کیلئے دل کو فارغ کر لو۔ خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ بھی عام استعمال ہوتا ہے، خضوع۔ دونوں کے معنی قریب قریب ہیں، نماز میں خشوع و خضوع ہوگا تو نماز میں حُسن، نکھار اور روح کی بالیدگی ہوگی، تاہم اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو فرض ادا ہو جائے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اے اولاد یعقوب (بنی اسرائیل) میرا وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور بے شک میں نے تمہیں سارے جہان والوں پر فضیلت دی۔ ﴿۵۷﴾

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآئِيْلُ اذْكُرُوْا اِنْعَمَیْۤیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنْیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵۷﴾

تفسیر

﴿۵۷﴾ پچھلی آیہ پاک میں انہیں صبر اور نماز کا حکم دیا گیا تھا کہ یہ ایمان اور تقویٰ کو حاصل کرنے کا بہترین راستہ ہے۔ اب اسی عمل کو حاصل کرنے کا ایک اور آسان راستہ بتایا جا رہا ہے کہ ہمارے انعامات کو یاد کر لو کہ تمہیں کس طرح سرفرازی بخشی، عزت سے نوازا، انبیاء علیہم السلام کو تم میں سے بھیجا بادشاہت تمہاری رہی اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا گیا جو کسی کو نہ دیا گیا اب اس انعام کے صلہ میں تمہیں چاہئے کہ آخر الزماں رسول پاک ﷺ کی اطاعت کرو، سرکشی چھوڑ دو، احسان اور انعام ظاہر فرما کر، ہدایت کی

طرف بلایا جا رہا ہے، یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کے واقعات کو یاد رکھنا بھی اصلاح کا باعث بن جاتا ہے۔ ان راستہ بھولے لوگوں کو ان کے آباؤ اجداد یاد دلا کر راہ راست پر لانے کا عمل ہے۔ انہیں ہدایت دی جا رہی ہے کہ پہلے تم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے سرفراز تھے اب تم سید الانبیاء علیہ السلام کی امت اجابہ بن کر اس سابقہ سرفرازی کو قائم رکھو۔ تمام جہان والوں کو فضیلت دینے کا یہ معنی ہو گا کہ تمہارے آباؤ اجداد کو اس زمانہ کے تمام لوگوں پر سرفرازی بخشی۔ حضور ﷺ کی آمد پر تو حکم دیدیا گیا، کنتم خیر امة کہ تم بہترین امت ہو۔ اس آیت پاک میں بنی اسرائیل کو دوبارہ انعامات یاد دلانے جا رہے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کا بدلہ نہ دے سکے گا اور نہ کسی شخص کی (اجازت الہیہ کے بغیر) سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی شخص سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی ﴿۵۸﴾

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۵۸﴾

تفسیر

﴿۵۸﴾ اس آیت مبارکہ کے سمجھنے میں بعض لوگ غلطی کر گئے اور کہہ دیا کہ قیامت کے دن مجرموں کی کسی قسم کی سفارش نہیں کی جاسکے گی۔ مسلک حقہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے انبیاء کرام علیہم السلام، علماء، حفاظ، قرآن حکیم، گناہگاروں کی شفاعت کریں گے۔ اس سلسلہ میں بخاری شریف کی یہ مشہور حدیث کافی ہے۔ قیامت کے دن حضور ﷺ بارگاہ رب العزت میں سجدہ کریں گے پھر حکم ہوگا ”ارفع راسک و اشفع تشفع سل تعطی او کما قال ﷺ“ (محبوب) اپنا سر اٹھائیے، سفارش کیجئے آپ کی

قبول کی جائے گی، سوال کیجئے آپ کو دیا جائے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں پھر میں اللہ کی حمد کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا پھر میرے لئے ایک حد مقرر کی جائے گی پھر میں گناہگاروں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کروں گا پھر میں دوبارہ سجدہ کروں گا، پھر شفاعت کروں گا۔ (بخاری شریف)

دوسری حدیث پاک میں اسی شفاعت کا ذکر اس طرح سے ملتا ہے قیامت کے دن میری شفاعت حاصل کرنے کا زیادہ حقدار وہ شخص ہوگا جس نے خلوص دل سے کلمہ پڑھا۔ شفاعت کا یہی عنوان مسلم شریف کی ایک اور حدیث شریف میں اس طرح ملتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہر نبی کی ایک دعا قبول ہوتی ہے اور ہر ایک نے دعا کو دنیا میں کر لیا اور میں نے اس دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کیلئے بچا کر رکھا ہے اور یہ دعا میری امت کے ہر اس فرد کیلئے ہوگی جو شرک سے پاک ہوگا۔ (مسلم شریف)

علامہ قرطبی نے اس عنوان پر بہت مختصر اور جامع فیصلہ دیا ہے فرماتے ہیں اس آیت پاک میں جو لفظ ”نفس“ کا ذکر ہے اس نفس سے مراد کافر کا نفس ہے مومن کا نفس نہیں کیونکہ مومن کی شفاعت کا ذکر تو بہت سی احادیث میں ملتا ہے۔ پھر یہ آیت مبارکہ کافروں کے حق میں نازل ہوئی جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ تو بہر حال نجات یافتہ ہیں انہیں حشر میں کسی قسم کی سزا کا سامنا نہیں ہوگا انکی تردید میں یہ حکم نازل ہوا ہے۔

مسلم شریف کی وہ حدیث مبارکہ جس میں حضور ﷺ نے بارگاہ قدس میں امت کیلئے دعا کی اور عرض کی ”اے اللہ! میری امت میری امت“ پھر آپ پر گریہ طاری ہو گیا جب جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی حضور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم تمہیں تمہاری امت کے بارہ میں راضی کر دیں گے اور رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔ (مسلم شریف ص ۱۱۰ ج ۱)

اسی عنوان پر مسلم شریف کی ایک اور حدیث شریف میں واضح بیان ہے جس شخص نے میرے لئے وسیلہ کی دعا کی اس پر میری شفاعت واجب ہوگی۔ (مسلم شریف ص ۱۶۶ ج ۱)

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ
سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ
وَيَسْتَعْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ
مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٥٩﴾

اور یاد کرو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے
نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب پہنچاتے تھے
تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری
بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمہارے
رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ ﴿۵۹﴾

تفسیر

﴿۵۹﴾ پھر ایک مرتبہ بنی اسرائیل کو انعامات الہیہ یاد دلانے جارہے ہیں کہ وہ اپنی اصلاح
کر سکیں بنی اسرائیل پر فرعون نے مظالم کئے، فرعون کے ظلم سے نجات کا ذکر ہے، بنی اسرائیل کو بتایا جا رہا
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس قدر احسان کیے اور تم کس قدر نافرمان بن رہے ہو۔ ”فرعون“ مصر کے بادشاہ کا
لقب ہے، اُسے خواب آئی تھی کہ بیت المقدس سے ایک آگ اٹھی ہے اور مصر کے مکانات کو جلاتی ہوئی بڑھ
رہی ہے، آگ نے قبطیوں کو جلا ڈالا ہے اور بنی اسرائیل کو کچھ نہیں کہا۔ پھر دیکھا کہ بنی اسرائیل کے محلے
سے ایک بہت بڑا اژدھا نکلا جس نے فرعون کو تخت سے نیچے گرا دیا۔

اس نے ملک کے ماہر تعبیر کرنے والوں کو بلایا کہ اس حیران کن خواب کی تعبیر بتائیں۔ انہوں
نے بتایا ایک شخص پیدا ہوگا جو مصریوں کو ہلاک کر ڈالے گا تب فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو
لڑکا پیدا ہو، اسے قتل کر دیا جائے اور لڑکی ہو تو چھوڑ دی جائے کہ اس بچے سے سلطنت کو بچایا جاسکے۔ ایک
وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں کثرت سے بچے ہوتے تھے فرعون کو خطرہ ہوا یہ تو بہت جلد
ملک پر اکثریت حاصل کر کے میری سلطنت چھین لیں گے اس لئے قتل کا حکم دے دیا۔

اس آیہ مبارکہ میں اس عظیم واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے، جو بنی اسرائیل کیلئے انتہائی

تکلیف دہ تھا۔ آل فرعون سے مراد فرعون کے متبعین ہیں اور اس کے اہل دین ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل پاک میں حضور کی اولاد، آپ کی بیویاں اور مومنین شامل ہیں)

فرعون کا نام ولید بن مصعب تھا۔ بنی اسرائیل پر اس بڑی مصیبت کے کئی پہلو دکھائی دیتے ہیں لڑکوں کا قتل، بنی اسرائیل کی خواتین کو کنیزائیں بنالیا گیا، جوانوں سے مشکل کام لئے جاتے جس سے وہ بڑی مصیبت میں مبتلا تھے، کچھ لوگوں پر روزانہ کاٹیکس، کمزور بوڑھے اسرائیلی نہایت ذلیل کاموں پر لگا دیئے گئے، بوڑھی خواتین کو سوت کا تنے پر، جوان لڑکیاں بغیر شادی نکاح کی مصیبت میں مبتلا تھیں کہ بچے سارے ذبح کئے جاتے تھے، بچوں کو دکھی ماؤں کی گود میں قتل کر دیا جاتا ان تمام مصائب سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے نجات دلائی اس ایک ہی آیہ کریمہ میں دو باتوں کا ذکر فرما دیا گیا ہے عذاب الہی اور نجات کا بھی کہ عذاب پر صبر اور نجات پر شکر کیا جائے۔ صبر اور شکر روحانی طور پر کامیابی کے حسین زینے ہیں۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا
الْفِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۶۰﴾

اور جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو چیر دیا پھر
ہم نے تم کو نجات دی اور پھر ہم نے آل فرعون کو
غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ ﴿۶۰﴾

تفسیر

﴿۶۰﴾ بنی اسرائیل پر ایک اور انعام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل گئے۔ (نکلنے کا سبب یہ بنا کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام کا ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کے پاس سے گزر رہا تھا جو جھگڑ رہے تھے، قبطی اسرائیلی کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اسے لکڑیاں اٹھوائے۔ آپ نے قبطی کو روکا وہ باز نہ آیا تو پھر آپ نے اسے مکا مارا جس سے وہ مر گیا آپ کا مکا مارنا اصلاح کیلئے تھا قتل کیلئے نہ تھا۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی جھگڑا ہوا آپ نے اس پر اسرائیلی کو روکا، وہ چیخا موسیٰ کل تو نے فلاں اسرائیلی کو قتل کیا

آج مجھے قتل کرنا چاہتا ہے یہ بات نکل گئی، فرعون تک پہنچی تو قبطیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے بدلہ لینا چاہا ایک حزقیل نامی شخص نے موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں، چنانچہ چھ لاکھ اسرائیلیوں کو لے کر چلے گئے تو فرعون کو انکے مصر چھوڑنے کی اطلاع ملی تو اُس نے چھ لاکھ قبطیوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا کہ پکڑے جاسکیں۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر بحر قلزم کے کنارے پہنچ گئے۔ قبطی بھی موقع پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی کہ موسیٰ سمندر پر اپنا عصا مارو جب آپ نے اپنا عصا مارا تو سمندر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بارہ (۱۲) گروہ ایک ایک راستہ پر چل کر امن سے پار گزر گئے اور قبطی غرق ہو گئے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسرائیلی چھ لاکھ تھے اور فرعون 12 لاکھ۔ تمہارے دشمنوں کو ہلاک تو اس صورت میں بھی کیا جاسکتا تھا کہ تمہیں پتہ ہی نہ چلے اور وہ برباد کر دیئے جائیں مگر یہاں پر انکی ہلاکت کی صورت مختلف تھی کہ تم انہیں ہلاک ہوتے مشاہدہ بھی کر رہے تھے یہ بھی ہمارا عظیم احسان تھا کہ تمہارے دشمنوں کو تمہارے سامنے برباد کر دیا۔ سوچو! تم کس گمراہی میں مبتلا ہو، کھلے بندوں ہمارے رسول ﷺ سے بغاوت کر رہے ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اس کے بعد تم نے ہچکچڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظالم تھے۔ ﴿۶۱﴾ پھر بھی ہم نے معاف کر دیا کہ تم شکر گزار بن جاؤ اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور معجزات (دئے کہ تم سیدھی راہ پر چلو۔ ﴿۶۲﴾

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِمَّنْ بَعْدَ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۶۲﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۶۳﴾

تفسیر

﴿۶۱﴾ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب فرعون غرق ہو گیا اور بنی اسرائیل امن سے رہنے لگے۔ تو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اب ہم مطمئن ہیں، زندگی گزارنے کا کوئی ضابطہ شریعت مقرر ہو جائے تو ہم اسے اپنا دستور بنالیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم طور پر آ جاؤ اور ایک مہینہ ہماری عبادت میں مصروف رہو تو تمہیں ایک کتاب دے دیں گے۔

آپ نے ایسا ہی کیا کتاب تورات شریف مل گئی مگر دس روز مزید عبادت کا حکم ہو گیا کہ آپ نے تیس روزے رکھنے کے بعد افطار فرما دیا تھا۔ قوم نے آپ کے بعد ایک شخص سامری کے پیچھے لگ کر اپنا دین برباد کر لیا اس نے پچھڑے کا جسم بنا کر اس میں وہ مٹی ڈال دی جو اس نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کے نیچے سے اٹھا کر محفوظ کی ہوئی تھی۔ اس پچھڑے سے آواز پیدا ہونے لگی پھر سامری نے بنی اسرائیل سے کہا یہ تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا ہے اور قوم گاؤ پرستی میں لگ گئی۔ حضرت ہارون اور بارہ ہزار افراد اس سے بچے رہے باقی پوری قوم گمراہ ہو گئی۔ ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے قوم کو بہت سمجھایا مگر قوم بگڑ گئی تھی اس آئیہ پاک میں اس اہم واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

﴿۶۲﴾ قوم کے اس ظلم و شرک کے واقعہ کا ذکر فرما کر پھر فرمایا کہ ہم نے پھر بھی تم پر کرم کیا، رحمت سے نوازا کہ تمہیں معاف کر دیا کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد قوم تین گروہوں میں بٹ گئی تھی ایک گروہ وہ تھا جو پچھڑے کی عبادت میں لگ گیا دوسرا وہ تھا جو ہارون علیہ السلام کے ساتھ رہا تیسرا وہ تھا جو خاموش تھا نہ پرستش کی، نہ عبادت کی، نہ مخالفت کی۔ پہلا اور تیسرا گروہ گمراہ ہو گیا دوسرا گروہ محفوظ رہ گیا جس سے پتہ چلتا ہے گمراہی پر خاموشی بھی گمراہی ہی ہے۔ برے کو برا کہنا چاہئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنكُمْ
ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوبُوا إِلَى بَارِيكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ
ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِيكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۶۳﴾

جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری
قوم بیشک تم نے مجھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر
ظلم کر لیا پس اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی
طرف توبہ کرو سو تم ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے
خالق کے نزدیک تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، تو
اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی بیشک وہی توبہ قبول
کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ ﴿۶۳﴾

تفسیر

﴿۶۳﴾ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جب توراۃ لے کر طور سے واپس آئے تو قوم کے بگڑے حالات
کا جائزہ لیا، اپنے بھائی سے جواب طلبی فرمائی، انہوں نے معذرت کی۔ سامری کے تیار کئے ہوئے مجھڑے
کو توڑ پھوڑ دیا اور دریا میں بہا دیا۔ تو اب قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں ان کا ظلم یاد دلایا کہ تم نے
مجھڑے کی پرستش کر کے اپنا ہی نقصان کیا ہے، اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ”اپنی قوم“ اس
لئے کہا کہ وطن ایک تھا، قبیلہ ایک تھا ورنہ مذہب کے لحاظ سے تو بہت دور جا چکے تھے۔ انہیں اپنے گناہ کی
توبہ کا حکم دیا وہ یہ تھا کہ تم اپنے قتل کرو اور تمہاری توبہ قبول ہو جائے گی، ہمارے ہاں تو گزشتہ جرم پر ندامت
، معافی اور آئندہ نہ کرنے کا عہد (توبہ کہلاتا) ہے۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں تو یہ تھا کہ اپنے قتل
کرائیں چنانچہ قوم نے بخوشی ایسا کرنا منظور کر لیا اور سینکڑوں ہزاروں افراد نے اپنی جانیں پیش کر دیں۔

ہوایوں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا مجرم غیر مسلح ہو کر اپنے دروازوں پر دوزانوں ہو کر
بیٹھ جائیں اور کوئی شخص اپنے قاتل کو دیکھے گا بھی نہیں، رکاوٹ بھی پیدا نہیں کریگا۔ اگر ایسا کیا تو قبول نہیں
ہوگی۔ چنانچہ جب انہوں نے ایسا کر لیا تو وہ بارہ (۱۲) ہزار آدمی جو ہارون علیہ السلام کے ساتھ تھے انہیں

حکم دیا گیا کہ وہ قتل کریں، جب وہ قتل کرنے کے منصوبہ سے آئے تو ہاتھ تھرا گئے اس لئے کہ عزیز رشتہ دار بچے، بوڑھے سبھی شامل تھے، تو ان پر سیاہ بادل بھیج دیا گیا، تاریکی چھا گئی تو اب انہیں قتل کرنا آسان ہو گیا۔ ستر (۷۰) ہزار کے لگ بھگ لوگ مارے گئے تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے بارگاہ قدس میں دعا کی اے اللہ اب معاف فرما اس طرح تو سارے قتل ہو جائیں گے۔ دعا قبول ہوئی اور انہیں ہتھیار پھینکنے کا حکم ہو گیا، اندازہ کیا جائے بنی اسرائیل کی توبہ کس قدر مشکل تھی اور ہماری توبہ کس قدر آسان ہے۔ پچھلے گناہوں سے شرم، معذرت، معافی اور آئندہ نہ کرنے کا عہد۔ یہ سارا کرم، یہ سارا فضل مصطفیٰ ﷺ کا صدقہ ہے جس کا ہمیں شکر ادا کرنا چاہئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ اللہ کو ظاہر و باہر دیکھ لیں تو پھر تمہیں ایک گرج نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ ﴿۶۴﴾ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کیا کہ تم شکر گزار بنو۔ ﴿۶۵﴾

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ بِكَ
حَتّٰى نَرٰى اِلٰهَ جَهَنَّمَ فَاَخَذْنَاكَ
الطُّعْنَةَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ
مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

تفسیر

﴿۶۴﴾ قوم نے موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات و اکرامات کا مشاہدہ کیا، مگر پھر بھی ہٹ دھرمی کا یہ عالم تھا کہ قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا ہمیں آپ کی باتوں

پر یقین نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ ہے اسے مانا جائے، ہم چاہتے ہیں کہ خدا کو واضح طور پر خود دیکھ لیں۔ اور خدا ہمیں خود کہے کہ توراۃ میری کتاب ہے اسے مانو۔ جب دیکھ لیں گے اور توراۃ کے کتاب الہی ہونے کا ارشاد سن لیں گے تو ہمیں ماننے پر اعتراض نہ ہوگا۔ اگرچہ نبی کے ساتھ یہ انداز خطاب کھلی گستاخی تھی مگر پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے حوصلہ فرمایا، صبر کیا، اصلاح کی کوشش کی اور فرمایا چلو طور پر، یہ بھی کام ہو جائے گا۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے ستر افراد کا انتخاب کیا، انہیں اپنے ساتھ طور پر لے گئے۔ انہوں نے رب قدوس کا ہر ارشاد سن لیا کہ توراۃ ہماری کتاب ہے مگر پھر بھی اڑے رہے کہ پتہ نہیں یہ بول کون رہا ہے۔ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں اس گستاخانہ لہجہ پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ ایک زبردست کڑک نے سب کو ہلاک کر دیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے انکی موت کو دیکھا تو بارگاہ قدس میں عرض کی یا اللہ! یہ قوم تو پہلے ہی مجھ پر بدگمان ہے۔ اب انکی موت بھی یہ میرے ذمہ لگا دیں گے کہ میں نے انہیں لے جا کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بارگاہ قدس میں دعا کی ”اے اللہ! انہیں زندہ فرما کہ اس الزام سے بچ سکوں“ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ فرمادیا۔ نبی کی دعا قبول فرمائی۔

﴿۶۵﴾ اس آیت میں اس عظیم واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور اپنا انعام یاد دلایا جا رہا ہے۔ اس آیت کریمہ پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ دنیا میں مرنے کے بعد اس دنیا میں دوبارہ زندہ کیا جانا، عادت الہیہ کے خلاف ہے۔ جواباً کہا جاسکتا ہے قانون یہی ہے کہ مرنے کے بعد دنیا میں کسی کو دوبارہ زندہ نہ کیا جائے مگر قدرت یہ ہے کہ چاہے تو ایسا کر دے اور اس نے ایسا کر دیا۔ قانون تو یہی ہے کہ آگ جلادے مگر قدرت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر گلزار ہو جائے یا جیسے قانون تو یہ ہے کہ چھری کاٹ دے مگر قدرت یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کا گلا نہیں کاٹتی۔

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر ہے کہ وہ چاہے تو دنیا میں دوبارہ زندگی بخش دے اور پھر اس واقعہ عظیمہ میں اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء علیہم السلام سے ایک تعلق بھی واضح ہو رہا ہے کہ انکی دعا سے

دوبارہ زندگی بھی دے دیتا ہے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کو قدرت کا ایک اور کرشمہ دکھانا مقصود ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَظَلَلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَیَ كُلُّوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۶۶﴾
اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوی
اتارا، ہم نے تمہیں جو پاک چیزیں دیں ان سے
کھاؤ (یہ نہ مان کر) انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا
لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ﴿۶۶﴾

تفسیر

﴿۶۶﴾ بنی اسرائیل کو ایک اور انعام یاد دلایا جا رہا ہے کہ جب تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ قوم عمالقہ سے جنگ کر کے اپنا ملک واپس لو اور تم جہاد کرنے کیلئے اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہوئے اور جب تم قوم عمالقہ کے قریب پہنچے اور ان کا جنگجو ہونا سنا، انکی ہیبت محسوس کی تو تم بزدل ہو گئے اور جہاد سے منہ موڑ کر واپس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس جرم کی سزایوں دی کہ تم چالیس سال تک ”وادی تہ“ میں پریشان گھومتے رہے۔ ”تہ“ کا معنی سرگردانی اور پریشانی ہے یہ میدان کوئی بہت بڑا میدان نہ تھا مصر اور شام کے درمیان قریب اسی بارہ میل کا رقبہ تھا، سارا دن سفر کرتے، رات ٹھہرتے، صبح دیکھتے پھر وہیں کے وہیں ہوتے۔ یہ عذاب تھا جو ان پر نازل ہوا مگر پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا و برکت سے یہی میدان تمام ضروریات پوری ہونے کا مرکز بن گیا۔ اس جنگل میں نہ سایہ تھا نہ خوراک۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے انہیں گرمی سے بچانے کیلئے بادل کا سایہ دیدیا، کھانے کیلئے من و سلوی بھیج دیا۔ من و سلوی یہ تھا کہ صبح و شام میں انہیں بھنا ہوا گوشت ملتا تھا یا یہ کہ پرندے ان کے ہاں اترتے وہ پکڑ کر ذبح کر لیتے تھے۔ من و سلوی ان کی میٹھی اور نمکین غذائیں تھیں، ان کیلئے سلعے سلائے کپڑے آسمان سے اترتے تھے یہ کپڑے نہ پھٹتے اور نہ ہی خراب

ہوتے تھے، بچہ ہونے پر یہ لباس اس کو دیا جاتا۔ اب جیسے جیسے بچہ بڑھتا جاتا یہ لباس بھی بڑھتا رہتا۔
اس آیت کریمہ میں ان انعامات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ آیت کریمہ کے آخری حصہ وما ظلمونا سے واضح ہے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی اکھڑ، بزدل، بے کار قوم، اور حضور ﷺ کی محنتی، وفا شعار، باہمت قوم میں بہت بڑا فرق ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یاد کرو جب ہم نے کہا اس شہر (بیت المقدس) میں داخل ہو اس میں تم جہاں سے چاہو، مزے سے کھاؤ اور بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہو حطہ (ہمارے گناہ معاف فرما) تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے اور نیک لوگوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔ ﴿۶۷﴾

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۶۷﴾

تفسیر

﴿۶۷﴾ یہ شہر جس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے بیت المقدس ہے یا اریحا۔ بعض نے کہا شام ہے صحاح کہتے ہیں یہ شہر رملہ تھا۔ جنگل تیمہ سے نجات کے بعد ایک اور نعمت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں بیت المقدس میں داخلہ نصیب ہوا اور وہاں کی نعمتیں بلا روک و ٹوک خوشی خوشی کھانے کا موقع ملا۔ جب انہیں داخل ہونے کا موقع ملا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور ”حطہ“ کہتے

داخل ہونا مگر انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور سجدہ ریزی کی بجائے اپنے سرینوں کو گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حطہ کہنے کی بجائے حنطہ فی شعرہ (گندم اپنے خوشے میں ہے) کہنا شروع کر دیا، انہیں سجدہ کرتے داخل ہونے میں اشارہ تھا کہ عجز و انکساری سے داخل ہونا، تکبر و غرور سے دور رہنا لوٹ مار سے بچنا لوگوں میں درگزر اور معافی کا اعلان کرتے جانا۔

چونکہ انہوں نے اپنے رب کی نافرمانی کی سرکشی میں مبتلا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی بیماری مسلط کر دی جس سے بڑی تباہی اور ہلاکت پھیلی بڑے بڑے لوگ تباہ ہوئے، چھوٹے بچے، ان کے بیٹے بیچ گئے۔ اس آیت کریمہ میں جنہیں محسن فرمایا گیا یہ ان کے بچے تھے یا انبیاء علیہم السلام۔ پھر ہم نے تم پر کرم بالائے کرم یہ بھی فرمایا کہ تمہارے دشمن لوگ جو بیت المقدس یا اریحا میں بس رہے تھے ان کے دلوں میں تمہاری ہیبت طاری کر دی کہ وہ تمہارے داخلے سے پہلے ہی شہر خالی کر گئے تھے تمہیں روحانی برکت اور توبہ کرنے کیلئے بیت المقدس شہر کا عطا کرنا یہ کرم نہیں تو کیا ہے۔ یہود کی اس سرکشی اور بغاوت کا ذکر اگلی آیت مبارکہ میں وضاحت سے فرما دیا گیا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي
قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٦٨﴾

بدل دیا ظالموں نے وہ جو کچھ انہیں کہا گیا تھا تو
ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل
کر دیا کہ نافرمان تھے۔ ﴿٦٨﴾

تفسیر

﴿٦٨﴾ یہ آیت مبارکہ پہلی آیت کریمہ کا تتمہ ہے وہ کلمہ جو کہنے کیلئے انہیں فرمایا گیا تھا وہ حطہ تھا مگر ان ظالموں نے اس کلمہ کو بطور مذاق اور استہزاء بدلا وہ ”حنطہ“ تھا یا کہا ”حبة فی شعرہ“۔ انہیں اس

سرکشی کی سزا یہ ملی کہ ان پر طاعون کا عذاب نازل ہوا، اس مہلک بیماری طاعون میں برباد ہونے والوں کی تعداد ستر ہزار تک بتائی گئی ہے۔ طاعون مہلک بیماری ہے اللہ تعالیٰ پناہ دے اس بیماری کیلئے علاج کے ساتھ ساتھ یاد الہی کی کثرت بہت مفید ہے۔

انکی اس سرکشی سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث کے الفاظ کی تبدیلی میں عذاب الہی ہے، اسے تحریف کہتے ہیں جیسے انہوں نے الفاظ بدل دیئے جس سے معنی بھی بدل گیا اگر معنی نہ بھی بدلتا پھر بھی الفاظ کا بدلنا جائز نہ تھا۔ قرآن مقدس کے تمام الفاظ کا یہی حکم ہے۔ قرآن مقدس کی تلاوت کا ثواب صرف انہیں الفاظ کے ساتھ ہی ہے جو قرآن پاک میں نازل ہوئے ہیں اگر الفاظ بدل کر پڑھے گا تو تلاوت قرآن نہ ہوگی اور نہ ہی اس پر ثواب ہوگا۔ ان گستاخوں پر طاعون عذاب تھا مگر حضور ﷺ کی امت کا کوئی فرد اس بیماری سے مر جائے تو اسے شہید کا ثواب ملتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں ہے پانی میں ڈوب کر، جل کر، طاعون سے مرنے والے کو شہید کا ثواب ملتا ہے۔ یہ شہید حکمی ہوگا، فقہی نہیں۔ حکمی شہدا کی تفصیل حدیث شریف سے ملتی ہے، پانی میں ڈوبنے والا، پیٹ کی بیماری سے مرنے والا، طاعون سے مرنے والا، مکان یا دیوار کے نیچے آکر مرنے والا سب حکمی شہید ہے۔ (بخاری شریف)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَايَهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ
بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ
عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرِبَهُمْ كَلُوا وَاشْرَبُوا
مِنْ رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٩﴾

اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کیلئے پانی کی درخواست کی تو ہم نے فرمایا اپنا عصا چٹان پر مارو تو (ایسا کرنے پر) فوراً چٹان سے ۱۲ چشمے بہہ نکلے ہر گروہ نے اپنے پینے کی جگہ کو پہچان لیا (ہم نے کہا) اللہ کے دئے ہوئے رزق سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۔ ﴿۶۹﴾

تفسیر

﴿۶۹﴾ جنگل تیبہ میں فرمائے گئے انعامات کے بعد اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنے ایک اور کرم کا ذکر فرما رہا ہے کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کریں اور سرکشی سے باز آئیں تیبہ میں جب انہیں پیاس لگی تو موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی اور دعا کی درخواست کی تو جناب موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، بارگاہ قدس سے حکم ہوا ”پتھر پر عصا مارو“ چنانچہ اس چٹان پر عصا مارنے سے بارہ چشمے بہہ نکلے۔

یہ لوگ بارہ گروہوں میں منقسم تھے ہر ایک نے اپنا اپنا چشمہ سنبھال لیا یہاں پر حضور سید دو عالم ﷺ کی عظمت کو بھی پیش نظر رکھیں، موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے پتھر سے چشمے بہہ گئے پتھر سے پانی کا بہنا عادتاً اور کمال ہے مگر انگلیوں سے پانی کا بہہ نکلنا بہت ہی بڑا کمال ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور حضور ﷺ کے معجزات کا موازنہ مطلوب ہو تو فقیر کی کتاب ”مدیۃ الرسول“ کا مطالعہ مفید رہے گا۔

حدیبیہ میں انگلیوں سے بہنے والے پانی سے پندرہ سو صحابہ نے وضو کیا۔ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے ستر صحابہ فرمایا۔ اسی طرح ایک مرتبہ یہی صورت مقام زور پر پیدا ہو گئی اور ستر صحابہ نے وضو کیا۔ اس آیہ پاک میں انعام کے ذکر کے بعد فرمایا گیا کہ انعام سے فائدہ اٹھاؤ خوب کھاؤ پیو مگر فساد نہ پھیلاؤ، اس کرم پر تو شکر ادا کرنا چاہئے نہ کہ فساد پھیلا یا جائے۔

ایک پادری دین اسٹینل نے اپنے فلسطین کے سفر میں اس پتھر کو دیکھا ہے جس سے پانی کے چشمے بہتے تھے۔ اور وہ آج تک موجود ہے اور سیاح لوگ دیکھتے ہیں اور 12 چشموں کے شکاف صاف دکھائی دیتے ہیں، جس عصا کا اس آیہ مبارکہ میں ذکر ہے یہ موسیٰ علیہ السلام کو سیدنا شعیب علیہ السلام سے ملا تھا یہ عصا آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے قرآن مقدس نے ایک دوسرے مقام پر اسکی خصوصیات کا بھی ذکر فرمایا ہے یہ عصا موسیٰ علیہ السلام کو بہت سی ضروریات پورا کرنے میں کام دیتا تھا۔ بعض علماء نے کہا یہ پتھر خاص تھا جس پر عصا مار تے تو پانی بہہ جاتا مگر معجزے کا پہلو زیادہ نمایاں اس طرح ہوتا ہے کہ جس پتھر پر عصا

مارتے پانی بہہ نکلتا۔

سیدنا حسن بصری کا موقف بھی یہی ہے پتھر سے پانی کے بہنے کا معجزہ سیدنا کلیم اللہ علیہ السلام سے کئی مختلف مقامات پر ظاہر ہوا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک قسم کے کھانے پر، سو آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ زمین سے اُگنے والی چیزیں سبزی، کٹڑی، گندم، مسور اور پیاز نکال کر دے۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا تم اچھی چیز کے بدلے میں ادنیٰ چیز مانگ رہے ہو، شہر میں چلے جاؤ وہاں پر تمہیں وہ چیزیں مل جائیں گی جن کا تم نے سوال کیا ہے اور ان پر ذلت اور بدحالی ڈال دی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آگئے یہ اس لئے ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے، شریعت کی حدود کو توڑ دیتے تھے۔ ﴿۷۰﴾

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْتِجُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلَها قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ إِمَّا يَحْسَبُوا مَصْرَافًا لَكُمْ فَأَسْأَلْتُمُو صُرْبًا عَلَيْهِمُ الدَّلِيلُ وَالسَّكْنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضِبَ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ

تفسیر

﴿۷۰﴾ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے ایک اور عمل کو انہیں یاد دلارہا ہے کہ تم نے من و سلوئی کے بجائے زمین

سے پیدا ہونے والی چیزوں کا مطالبہ کیا حالانکہ من و سلویٰ اعلیٰ شئی تھی اور تم نے اس کے بدلے میں ادنیٰ شئی مانگ لی۔ زمین سے اگنے والی چیزوں کیلئے تمہیں محنت، کاشت کا دکھ اٹھانا ہوگا، تم نے زندگی کا اصل مقصد کھودیا اور عارضی قسم کے مطالبات شروع کر دیئے۔ روحانی غذاؤں کی بجائے جسمانی خورد و نوش پر مائل ہو گئے تمہیں چاہئے تھا اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کے احکام کی اطاعت کرتے، اس سرکشی کے باعث ان پر ذلت اور بد حالی مسلط کر دی گئی۔

انبیاء علیہم السلام سے کفر کرنے کا معنی یہ بھی ہے کہ انکی نبوت کے قائل ہی نہ ہوئے یا یہ معنی بھی ہے کہ ان کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا، یہ معنی بھی ہے کہ پچھلے بندوں کی مخالفت کرتے رہے، یہ بھی ہے کہ احکام کو بگاڑتے رہے اور استہزا کرتے رہے اور شرعی حدود کو پھاند پھاند کر مخالفت کرتے رہے۔ انبیاء علیہم السلام کا ناحق قتل بھی ان عظیم جرائم سے ہے، وہ جانتے بھی تھے کہ انبیاء پر زیادتی کر رہے ہیں مگر ضد اور عناد نے انہیں اندھا بنا رکھا تھا۔ یہود کے اس جرم کو بائبل نے کئی مقامات پر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ توارخ باب 17، سلاطین باب 19، بریتاب 15 غاموس باب 7 اس کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ یہ لوگ کس قدر انبیاء کے دشمن تھے۔

اس آئیہ مبارکہ میں بنی اسرائیل سے فرمایا گیا ہے کہ تمہاری رسوائی اور ذلت تمہاری بد عملی کا نتیجہ ہے ہماری طرف سے زیادتی نہیں۔ یہ بنی اسرائیل کی ناشکری ہی تھی کہ من و سلویٰ کے انعامات سے اکتا گئے اور سبزیوں کا اصرار کرنے لگے اسی کا نام کفران نعمت ہے۔

اگر یہ سوال ذہن میں آئے کہ یہود تو آجکل پوری دنیا میں امیر شمار ہوتے ہیں ان پر ذلت کیسے مسلط کر دی گئی۔ تو جیوش انسائیکلو پیڈیا ص ۱۵۱ ج ۱۰ کا مطالعہ مفید جواب ہے۔ نیز یہ بھی ذہن میں رہے یہودی قوم بحیثیت قوم غریب ہی ہے۔ اس میں سے چند افراد کا دولت مند ہونا قوم کا دولت مند ہونا نہیں۔ اس سوال کا جواب قرآن مقدس کی اس آئیہ مبارکہ سے بھی ملتا ہے ”الا بحبل من اللہ وحبل من الناس“

(آل عمران) یہ جہاں کہیں بھی رہیں گے ذلیل رہیں گے۔ ہاں اللہ کی رسی اور لوگوں کا سہارا لیں۔ اسرائیلوں کی آج حکومت امریکہ اور برطانیہ کے سہارے سے ہی ہے۔ برطانیہ امریکہ آج ہاتھ اٹھالیں تو اسرائیل کا نام و نشان مٹ جائیگا۔

فلسطین میں یہود کی حکمرانی سے تمام اہل علم حضرات واقف ہیں کہ یہ خطہ برطانیہ اور امریکہ کی ایک کالونی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بغیر امریکہ، برطانیہ کے ان کا وجود ایک ہفتہ بھی نہیں رہ سکتا یہ کفر کی سازش ہے کہ اسلام کو کمزور کیا جائے اور پھر پوری دنیا میں اگر اس کالونی کا وجود نظر آتا بھی ہے تو دنیا کے سمندر میں ایک چھوٹا سا بلبلہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۰۰﴾

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (مسلمان) اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے عیسائی، اور صابی جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور اچھے کام کئے ان کیلئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں نہ ان پر خوف ہو گا نہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۱۰۰﴾

تفسیر

﴿۱۰۰﴾ اس آیت مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ ہمارے ہاں کسی قوم، قبیلہ، گروہ کی تخصیص نہیں کہ وہی جنت میں جائے گا بلکہ جو بھی اتباع و اطاعت اور اعمال صالح اختیار کرے گا ہمارے کرم کا حقدار بن جائے گا۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی تردید فرمائی گئی ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ وہ کچھ کریں یا نہ کریں، جنت میں جائیں گے۔ ایسا نہیں ہمارے ہاں تو ایک قانون ہے، ضابطہ ہے، جو بھی اس ضابطہ کو اپنائے گا، جنت کا

حقدار ہو جائے گا اور وہ ضابطہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانا ہے، اور خدا پر ایمان لانا اس وقت تک ہو سکتا ہی نہیں جب تک حضور ﷺ پر ایمان نہ لایا جائے۔ جیسے سورۃ النساء شریف میں ہے ”یٰۤایہا الذین آمنوا آمنوا باللہ رسولہ“ ایمان والو، اللہ (تعالیٰ) اور رسول اللہ (ﷺ) پر ایمان لاؤ، جب تک یہود و نصاریٰ جو اپنے زمانہ میں اپنے نبی پر ایمان لائے وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے، اس انعام کے حقدار نہ بن سکیں گے کہ قیامت کے دن انہیں خوف و غم نہ ہو۔ یہ انعام حاصل کرنے کیلئے ان پر لازم ہے کہ اسلام میں داخل ہوں ورنہ ان کی کوئی عبادت، اطاعت قبول نہ ہوگی۔

اس عنوان کو قرآن مقدس نے اس طرح ارشاد فرمایا ”ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ“ جس نے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کیا وہ قبول نہ ہوگا۔ حضور ﷺ کی آمد سے قبل تو ہر نبی کے دروازہ سے خدا تک پہنچنے کی راہ تھی مگر حضور ﷺ کی بعثت کے بعد وہ ساری راہیں بند کر دی گئیں اب تو صرف ایک ہی شاہراہ باقی ہے جو خدا تک پہنچاتی ہے وہ اسلام ہے اور صرف اسلام ہے۔ اور اسلام حضور ﷺ پر ایمان لانے کا نام ہے۔

یہاں پر یہ اشکال بے معنی ہوگا کہ اگر یہود و نصاریٰ، صابی بھی عمل صالح کریں آخرت کو مانیں، اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں تو قیامت کو جہنم سے بچ جائیں گے، جواب اوپر کی سطور میں گزر گیا ہے کہ اللہ پر ایمان لانا، حضور ﷺ پر ایمان لانے سے مشروط ہے۔ اس آیت مبارکہ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مسلمان، یہود، نصاریٰ، صابی جو خلوص دل سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے وہ قیامت کو بے خوف ہوں گے اس معنی سے منافقین خارج ہو گئے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دل سے نہیں مانا، اللہ پر ایمان ہے ہی یہی کہ رسول اللہ ﷺ کو مانا جائے۔ ”صابی“ کا معنی ہے نکل جانا، یہ یہودیت سے نکل کر ستارہ پرست بن گئے تھے اس لئے انہیں صابی کہا گیا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ صابی عیسائیوں اور مجوسیوں کے درمیان ایک گروہ ہے ان کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرشتوں کی پرستش کرتے تھے، آجکل یہ فرقہ قریباً ناپید ہے۔ کہتے ہیں

عراق کے علاقہ میں ان کا وجود ہے۔ (واللہ اعلم)

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ
 وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ
 خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ
 لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِمَّنْ
 بَعَدَ ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَ
 رَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پکا عہد لیا اور تم پر طور کو
 اٹھایا اور (حکم دیا) مضبوطی سے پکڑ لو جو ہم نے تم کو
 دیا اور یاد کرو جو کچھ اس میں درج ہے کہ تم پر ہیزگار
 بن جاؤ۔ ﴿۷۲﴾ پھر تم پختہ وعدہ کرنے کے بعد
 پھر گئے اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم
 نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے۔ ﴿۷۳﴾

تفسیر

﴿۷۲﴾ آیہ نمبر ۶۳ میں بنی اسرائیل کی ایک بد عہدی کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جب انہوں نے
 موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی ہمارے لئے کوئی ضابطہ قانون بنایا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمادی
 ، جب انہوں نے اسے پڑھا تو بعض احکام سخت بھی تھے اس سے گھبرا گئے اور انکار کر دیا یہ ایک بہت بڑی عہد
 شکنی تھی، مضبوط قسم کے عہد کو ”ميثاق“ کہا جاتا ہے۔ جب یہ عہد شکنی ہو گئی تو پھر ان پر طور کو شامیانہ کی مانند کھڑا کر
 دیا گیا جبریل علیہ السلام طور کو اپنی جگہ سے پروں پر اٹھا کر لائے اس وقت بنی اسرائیل چار میل کے اندر پھیلے
 ہوئے تھے، پہاڑ کو بھی اسی قدر وسیع کر دیا گیا، لفظ طور نے بعض کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ یہ کوئی اور پہاڑ تھا یہ
 وہی تھا جس پر موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب قدوس سے ہمکلامی کا شرف ملا تھا۔ پہاڑ کے سر پر لانے کے بعد انہیں
 حکم دیا گیا کہ جو کچھ اس میں ہے اسے مضبوطی سے یاد کرو، اس پر عمل کرو کہ تم پر ہیزگار بن سکو۔
 جن پر طور کو اٹھایا گیا یہ وہی ستر آدمی تھے جو موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ طور پر لے گئے تھے،

جنہوں نے توراۃ مانگی تھی، یا پوری قوم۔ زیادہ قرین یہی بات ہے کہ پوری قوم تھی کہ اس پوری قوم نے اُن ستر نمائندگان کی اتباع میں سب کچھ کہا تھا۔ اسی آئیہ پاک میں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ توراۃ کو مضبوطی سے پکڑو، اس میں توراۃ کی حفاظت کا حکم ہے۔ ”لعلکم تتقون“ سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب کا پڑھنا ہی اصل مقصد نہیں بلکہ پڑھ کر اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ کتاب الہی کا عمل کے بغیر پڑھنا بے فائدہ ہے تو ان کا یہ نظریہ غلط ہے، قرآن پاک کی توزیارت بھی ثواب اور تلاوت بھی ثواب ہے البتہ بہت ہی ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔

بعض لوگوں کو اس جگہ غلط فہمی ہو گئی کہ بنی اسرائیل کو پہاڑ سر پر کھڑا کر کے ایمان لانے کو کہا گیا ہے۔ یہ اکراہ ہے اور دین میں اکراہ (جبر) جائز نہیں۔ جواباً تحریر ہے یہ اکراہ ہرگز نہیں، اکراہ ہوتا ہے دین قبول کرنے کیلئے کسی کو مجبور کیا جائے، یہ لوگ دین تو بخوشی لا چکے تھے اب تو انہیں ان کی سرکشی اور بغاوت کرنے پر سزا کا ذکر ہے، ہمیشہ باغیوں کو کہا جاتا ہے کہ ”مانویا موت کیلئے تیار ہو جاؤ“۔ اس وجہ سے اسلام نے مرتد کی سزا قتل فرمائی ہے۔ کسی کافر کو کافر ہونے کی بناء پر قتل کا حکم نہیں، تمام یہود و نصاریٰ اسلامی ریاستوں میں امن میں ہیں۔

﴿۷۳﴾ آئیہ نمبر ۶۴ میں فرمایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل! تمہارے عہد توڑنے کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہیں برباد کر دیا جاتا مگر ہمارا کرم اور فضل پھر بھی تمہارے ساتھ رہا، اگر ایسا نہ ہوتا تو تم تباہ و برباد ہو جاتے۔ حضور ﷺ پر ایمان نہ لانا بھی اس عہد شکنی میں آتا ہے، پھر بھی ہمارا فضل ہے کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب مسلط نہیں کیا حالانکہ پہلے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے کہ فوراً عذاب اتر آتا تھا، مگر تمہاری اس سرکشی کی سزا کو قیامت کے دن تک ملتوی کر دینا بھی ہماری رحمت ہے، فضل ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي
السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ
فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّبَاطِلِينَ يَذَرُهَا مَا خَلَقَهَا
وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝

اور تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتہ کے
سلسلہ میں نافرمانی کی تھی، تو ہم نے انہیں حکم دیا
کہ ذلیل بندر بن جاؤ ﴿۷۴﴾ پھر ہم نے ان
کی اس سزا کو موجودہ اور بعد میں آنے والے
لوگوں کیلئے عبرت اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت
بنادیا۔ ﴿۷۵﴾

تفسیر

﴿۷۴﴾ بنی اسرائیل کے ساتھ یہ واقعہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا، بنی اسرائیل
کیلئے ہفتہ کا دن بہت ہی معزز تھا اور یہ دن انکی عبادت کیلئے خاص تھا، اس دن ان کیلئے دنیوی کاروبار، لین
دین، تجارت، شکار بھی منع تھا۔ اس قانون پر اس قدر سختی سے عمل کیا جاتا تھا کہ اس ضابطہ کے خلاف چلنے
والوں کی سزا قتل مقرر تھی۔ چونکہ ہفتہ کو شکار ممنوع تھا، مچھلیاں شکاریوں کے نہ آنے کے باعث بے خوف ہو
کر دریا میں تیرتیں۔ بنی اسرائیل نے اس شکار کیلئے بہانہ یہ بنایا کہ دریا سے نالیاں نکال کر اپنے اپنے
گڑھوں میں لے گئے، مچھلیاں ہفتہ کو ان نالیوں کے ذریعہ پانی کے بہاؤ سے ان گڑھوں میں چلی جاتیں
اور بنی اسرائیل ان نالیوں کے منہ بند کر دیتے، مچھلیاں وہیں رہ جاتیں اور اتوار کی صبح کو شکار کر لیتے۔ اس
سازش پر بنی اسرائیل تین حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلا گروہ جس نے شکار کو جائز کہا، دوسرا گروہ جس
نے ناجائز کہا اور ڈرتے رہے، تیسرا گروہ جو خاموش رہا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں ایسے حیلوں
بہانوں سے روکا مگر نہ رکے تو آپ نے بددعا کر دی، اللہ کا غضب نازل ہوا، شکلیں بدل گئیں یہ عذاب
رات کو نازل ہوا، جسموں سے بدبو نکلتی تھی، صبح کو لوگوں نے حالت دیکھی یہ بندر روتے، چیختے ان کے
قدموں پر گرتے، تین دن بعد ہلاک کر دیئے گئے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ ان کی صورتیں تو انسانوں کی رہیں مگر عادات بندروں کی ہو گئیں، مگر جمہور علماء کا قول یہی ہے کہ ان کی شکلیں بھی بندروں کی ہی ہو گئی تھیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، حضور ﷺ سے بندروں کے بارہ میں پوچھا گیا، کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ تو فرمایا اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مسخ فرماتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلتی۔ آیت ۶۵ میں ان کی نافرمانی پر ان کی سزا کا ذکر ہے کہ ان کی شکلیں بندروں کی سی ہو گئیں اور ذلیل ہو گئے،

﴿۷۵﴾ آیہ نمبر ۶۶ میں فرمایا گیا ان کی یہ سزا پہلوں اور پچھلوں کیلئے عبرت بنادی گئی اور نیک لوگوں کیلئے نصیحت۔ دونوں آیات مقدسہ کی ترتیب بتاتی ہے کہ رحمت کو غضب پر غلبہ حاصل ہے۔ پہلی آیہ میں غضب کا ذکر ہے دوسری میں رحمت کا۔ ارشاد ربانی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ”ان رحمتی سبقت علی غضبی“ میری رحمت کو غضب پر سبقت حاصل ہے۔ گناہ اور جرائم سمندروں کے قطروں، درختوں کے پتوں، انسانوں، حیوانوں کے بالوں سے زیادہ کیوں نہ ہوں مگر اللہ کی رحمت اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس کرم کو دیکھ کر گناہوں پر دلیری حرام ہے، غضب الہی اور اس کے قہر سے ڈرنا یہی ایمان ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَكُونُ مِنْ الْجَاهِلِينَ ۚ قَالَ أَاعُذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْبَهِيلِينَ ۖ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَتْ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوْنِ بَيْنَ ذَلِكَ فافعلوا مَا تُمَرُّونَ ۖ

وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، انہوں نے کہا کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں۔ (قوم نے کہا) اپنے رب سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں اس گائے کی تفصیل بتائے، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اللہ فرماتا ہے وہ گائے، ایسی ہونی چاہئے، نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ درمیانی عمر کی ہو جو حکم دیا جاتا ہے اُسے مانو۔ ﴿۷۶﴾

تفسیر

﴿۷۶﴾ اس واقعہ کی قدر تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک مالدار شخص تھا، اس کے ہاں اولاد نہ تھی اُس کے وارث نے اُسے قتل کر دیا کہ اس کی جائیداد کا مالک بن سکے، لاش کو عام گزرگاہ پر پھینک دیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام سے جا کر اپنے مصنوعی دکھ کا اظہار کیا کہ اس کا قریبی رشتہ دار قتل کر دیا گیا ہے۔ قاتل کا پتہ نہیں چل رہا، موسیٰ علیہ السلام کے عام اعلان کرنے سے بھی پتہ نہ چل سکا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، اس پر قوم نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا خدا پناہ! کہ میں جاہلوں سے بنوں۔ تب قوم نے کہا اپنے رب سے دعا کریں وہ ہمیں بتائے وہ گائے کیسی ہو۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھڑی بلکہ درمیانی عمر کی ہو، اب تمہیں جس کا حکم دیا گیا ہے وہ کرو۔ آیت نمبر ۷۷ میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قوم کے رویہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا ”تو ہم سے ہنسی مذاق کرتا ہے“ کہاں قاتل

تلاش کرنے کی بات کہاں گائے ذبح کرنے کا مسئلہ۔ قوم کو اپنے نبی سے گفتگو کا یہ انداز قطعاً نہ چاہئے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدا پناہ میں تمسخر کروں، تمسخر استہزاء مذاق تو جاہلوں کا کام ہے، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے اس واقعہ میں بنی اسرائیل کی حکم عدولی، نبی کے حکم سے لاپرواہی، بے جا سوالات ایسے کاموں کی مذمت کی جا رہی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا
قَالَ إِنَّكَ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءٌ فَاقِعٌ
لَوْنُهَا تَسُرُّ النُّظُرِينَ ﴿۷۷﴾

انہوں نے کہا ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں وہ ہمیں یہ بیان کر دے کہ اس کا رنگ کیسا ہو، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہونی چاہئے جس کا رنگ ایسا تیز ہو کہ دیکھنے والوں کو خوش کر دے۔ ﴿۷۷﴾

تفسیر

﴿۷۷﴾ اس آیہ پاک میں بھی بنی اسرائیل کے ناپسندیدہ انداز گفتگو کی مذمت ہے انہیں چاہئے تھا کہ نبی کے حکم پر فوری کار بند ہو جاتے اور تعمیل کرتے مگر انہوں نے حسب عادت اور اپنی پرانی سرشت کے مطابق ججیتیں نکالنا شروع کر دیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھیں۔ بنی اسرائیل کو اس سے حیرت ہوئی کہ گائے میں مردہ زندہ کرنے کی تاثیر تو ہے نہیں کوئی خاص گائے ہوگی تو آپ نے فرمایا وہ گائے گہرے پیلے رنگ کی ہو جس سے دیکھنے والوں کو خوشی ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ
إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ
اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۖ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ أَذْلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ
مُسْلِمَةٌ لَا شَيْءَ فِيهَا قَالُوا لَنَنَحِّثَنَّ
بِالْحَقِّ قَدْ جَعَلْنَا مَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۖ

بنی اسرائیل نے کہا اپنے رب سے ہمارے لئے دعا
کریں وہ بتا دے گا کہ گائے کس قسم کی ہو ہمیں اس
گائے میں شبہ پڑ گیا ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم
ضرور ہدایت پا جائیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے
کہا اللہ فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہو جو نہ ہل چلاتی ہو
اور نہ ہی کھیتی کو پانی دیتی ہو، وہ صحیح سالم ہو، بے داغ
ہو تو انہوں نے کہا اب ٹھیک بات ہے پھر انہوں نے
ذبح کیا وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کریں گے۔ ﴿۷۸﴾

تفسیر

﴿۷۸﴾ گائے کے اس سارے واقعہ میں چند ایک اہم باتیں واضح طور پر محسوس ہو رہی ہیں۔
بنی اسرائیل جیسے بھی تھے، مگر اپنے ہر معاملہ میں اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے ہی درخواستیں کرتے رہے،
جس سے واضح ہے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو سن لے گا۔ نیز اگر کسی بھی
کام پر ان شاء اللہ پڑھا جائے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کام آسان کر دیتا ہے، استہزاء، مذاق جاہلوں کا
کام ہے، اس سے بچا جائے۔ زرد رنگ پسندیدہ رنگ ہے بنی اسرائیل کو چاہئے تھا کہ وہ فوراً عمل کرتے
بحث نہ کرتے، اعتراضات میں نہ پڑتے مگر وہ اس سعادت سے محروم رہے۔

یہ گائے جو ذبح کی گئی اس کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ملتی ہے، بنی
اسرائیل کا ایک نوجوان دکان چلاتا تھا، اس کا باپ بوڑھا تھا کسی دن ایک گاہک آیا اور سودا لینا چاہا، اس
دکان کی چابی اس کے والد کے پاس تھی وہ سویا ہوا تھا، نوجوان نے گاہک سے معذرت کی کہ چابی اس کے

والد کے پاس ہے، وہ سویا ہوا ہے، گاہک نے بہت کوشش کی کہ وہ اسے جگادے اور اپنے سودے کی قیمت میں اضافہ کر لے مگر نوجوان نے اپنے بوڑھے والد کو بے آرام نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کو اپنے والد سے محبت کے صلہ میں اس کے گھر وہ گائے پیدا کی جس کی بنی اسرائیل کو تلاش تھی بنی اسرائیل نے اس نوجوان سے نہایت مہنگے داموں یہ گائے خریدی۔ قدرت کی طرف سے اس نوجوان کو والد کی محبت کا عظیم صلہ ملا۔ مفسرین نے اس طرح بھی لکھا ہے کہ ایک نیک شخص نے مرتے وقت اپنے معصوم بچے کیلئے ایک گائے اللہ کے حضور بطور امانت جنگل میں چھوڑ دی، جب یہ جوان ہوا اور جنگل میں گیا تو گائے اس کے پاس آگئی، اس کے اندر تمام صفات تھیں جو بنی اسرائیل کو مطلوب تھیں انہوں نے مہنگے داموں خریدی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا اور پھر اس میں ایک دوسرے کو ملوث کرنے لگے اور اللہ اس کو ظاہر کرنے والا ہے جسے تم چھپاتے تھے، تو ہم نے کہا اس گائے کے ایک ٹکڑے کو اس مقتول پر مارو، اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ فرمائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ ﴿۷۹﴾

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَرَأْتُمُ فِيهَا
وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٩﴾
فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ
يُخَيِّ اللَّهُ الْمَوْتَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُونَ ﴿٨٠﴾

تفسیر

﴿۷۹﴾ بنی اسرائیل کو واقعہ یاد دلایا جا رہا ہے، کہ جب تم نے گائے ذبح کرنے میں ٹال مٹول اور بے ڈھبے سوالات کرنا شروع کئے، آخر مطلوبہ گائے ملنے پر تم نے ذبح کرا لی تو ہم نے حکم دیا کہ، گائے

کی زبان یا دُوم کو مقتول کے جسم پر مارو، وہ جی اُٹھے گا۔ تم نے ایسا ہی کیا تو اس نے زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دیا اور قاتل وراثت سے بھی محروم کر دیا گیا اور پھر قصاص کے طور پر قتل بھی کیا گیا۔ اس واقعہ سے سمجھ لو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی مردوں کو زندہ فرمائے گا اور حساب کتاب لے گا اس اللہ جل جلالہ پر ایمان لاؤ اور پھر ثابت قدم رہو۔

اس واقعہ سے مقتول کا زندہ ہو کر قاتل کا نام لینا اور پھر اس پر فرد جرم کا لاگو کرنا اور اُسے قتل کرنا یہ حیران کن ہے۔ کسی پر قتل کا حکم تو اسی وقت لاگو ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا عینی شاہد ہو، یہاں پر تو شرعی شہادت کی کوئی صورت نہیں، یہاں صرف مقتول کے بیان پر ہی قصاص کا حکم ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتا دیا گیا تھا کہ مقتول سچ بولے گا، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قدرت الہی تو ہے مگر موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ بھی ہے، معجزہ تو ہوتا ہی وہ ہے جو عقل و فکر سے بالاتر ہو۔ معجزہ عقل میں نہیں آتا، ایمان میں سماتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال بھی بے معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ویسے ہی بذریعہ وحی موسیٰ علیہ السلام کو قاتل کا نام بتا دیتا۔ قدرت کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام کی حکمت انسانی سمجھ میں آئے۔ نیز یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بے ڈھب گفتگو اور نبی علیہ السلام کے سامنے بے معنی بحث کی وجہ سے انہیں کچھ مشقت میں بھی ڈالنا چاہتا تھا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ
كَالْجَارِقَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنْ مِنْ
الْجَارِقَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنْ مِنْهَا
لَمَا يَسْقَلُ فَيَنْجُرُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَا
يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۸۰﴾

پھر اس (مشاہدہ و منظر) کے بعد تمہارے دل
(پتھروں کی طرح) بلکہ اس سے زیادہ سخت ہو گئے
(کہ) بعض پتھر بھی ایسے ہیں جن سے نہریں بہہ
نکلتی ہیں اور بعض پتھر ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں تو
اُن سے پانی بہہ نکلتا ہے اور بے شک بعض پتھر
ایسے بھی ہیں جو خدا کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ
تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ ﴿۸۰﴾

تفسیر

﴿۸۰﴾ اس آیہ مبارکہ میں بنی اسرائیل کے سخت رویہ کی مذمت کی جا رہی ہے کہ تم نے بہت
سے نشاناتِ قدرت کا مشاہدہ بھی کر لیا پھر بھی تعصب اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے مثلاً بنی اسرائیل کے
سروں پر پہاڑ کا اٹھانا، ہفتہ کے دن شکار کرنے والوں کی شکلوں کا مسخ ہونا، پھر مقتول کا زندہ ہو کر قاتل کا نام
بتانا، کہ ایسے اہم واقعات کے بعد بھی تمہاری اصلاح نہیں یہاں پر اُن کے دلوں کی سختی کو پتھروں کی سختی سے
تعبیر کیا گیا اور پھر فرمایا گیا کہ بعض پتھر بھی ایسے ہیں جن سے پانی بہہ جاتا ہے بعض اس کے خوف سے گر
جاتے ہیں، بعض پتھروں سے نہریں بہہ نکلتی ہیں۔ تم تو پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہو، پتھروں سے
بہت سے واقعات نمایاں ہیں۔

قرآن مقدس نے بھی فرمایا اگر ہم قرآن پاک کو پتھروں پر بھی اتارتے تو تم انہیں بھی خدا کے ڈر
سے پھٹا ہوا دیکھتے، پتھروں کی بہت سی خوبیاں احادیث مبارکہ سے ملتی ہیں، پتھروں نے حضور ﷺ کی نبوت کی
گواہی دی ہے، جب ابو جہل نے کہا ”اگر تو اللہ کا رسول ہے اور زمین و آسمان کی خبریں رکھتا ہے تو بتا میرے

ہاتھ میں کیا ہے؟“ حضور ﷺ نے فرمایا میں بتاؤں یا وہ چیز خود ہی بول اُٹھے، چنانچہ پتھروں نے ابو جہل کے ہاتھ میں باواز بلند کلمہ پڑھا۔ پتھروں نے پورا کلمہ شریف پڑھا۔ مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے

لا الہ گفت الا اللہ گفت گو ہر احمد رسول اللہ گفت

پتھروں نے پورا کلمہ شریف پڑھا۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے میں حضور ﷺ کے ساتھ باہر نکلا تو آپ جس پتھر یا درخت کے پاس سے گزرتے وہ سلام کہتا۔ ترمذی شریف میں سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام سے روایت ملتی ہے آپ فرماتے ہیں ”میں حضور ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا، آپ جس بھی پہاڑ یا درخت کے پاس سے گزرتے وہ کہتا تھا السلام علیک یا رسول اللہ“ (ترمذی شریف ص ۵۲۲)

اس آیہ مبارکہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے کیلئے علم و عقل ہونے کی کوئی شرط نہیں پتھر بھی خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں جبکہ ان میں نہ علم ہے نہ عقل ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں پتھروں کی تین قسموں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مگر یہ تو پتھروں سے بھی گئے گزرے ہیں کہ پتھر اثر قبول کرتے ہیں اور یہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اے مسلمانو! کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ یہ تمہارے

کہنے پر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان کا ایک

طبقہ اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اس کو سمجھنے کے باوجود

اس میں تحریف (تبدیلی) کر دیتا تھا۔ ﴿۸۱﴾

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يَحْكُمُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَغْلِبُوْنَ ﴿۸۱﴾

تفسیر

﴿۸۱﴾ یہ آیہ مبارکہ انصار کے متعلق نازل ہوئی جو یہود کے حلیف تھے، پڑوسی تھے وہ چاہتے تھے کہ یہود

مسلمان ہو جائیں، انہیں فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانو! یہ بات ذہن سے نکال دو کہ یہود تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے، یہ لوگ تو بہت ضدی طبیعت کے ہیں ان کے رویہ میں تعصب ہے، ان کا انکار اس وجہ سے نہیں کہ یہ حق کو جاننے نہیں۔ حضور ﷺ کے بارے میں تورات کی بشارات روز روشن کی طرح ملتی ہیں مگر ان میں عناد بھرا ہوا ہے، ایسے لوگوں سے ایمان کی امید رکھنا بے کار ہے۔ ایسے دنیا کے پرستار لوگوں سے حق کی حمایت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

یہاں پر کلام اللہ سننے سے مراد تورات سننا ہے اور ان یہود نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے سنا تھا یا وہ کلام سننا مراد ہے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ جب طور پر آپ رب عز وجل سے کلام کریں تو ہمیں بھی سنا دیا جائے، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی جو قبول ہو گئی۔ موسیٰ علیہ السلام انہیں پاک، صاف کر کے طور پر لائے اور سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا، انہوں نے مانا۔ اللہ تعالیٰ نے احکام دیئے جو انہوں نے سن لیے مگر پھر تحریف کر دی اور احکام بدل دیئے۔

تحریف سے مراد توراۃ کے کلمات کو بدلنا بھی ہے اور معنی غلط کرنا بھی ہے یا دونوں صورتوں کو اکٹھا کرنا بھی ہے۔ اگرچہ حضور ﷺ کے زمانہ کے یہود سے یہ کام نہ ہوا تھا مگر چونکہ یہ لوگ اپنے پہلے لوگوں کے کردار پر نفرت نہ کرتے تھے اور ان کے ہر کام کی تصدیق کرتے تھے، لہذا یہ بھی اسی حکم میں شامل ہوں گے۔ توراۃ کے بیان کو بدل دینے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی وہ بشارات جو توراۃ میں تھیں ان کا مفہوم بدلا، یا ان کا سارا مضمون ہی بدل دیا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا
بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُوحَدُّنَهُمْ بِمَا
فَتَّحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُخَاجِبَكُمْ بِهِ عِندَ
رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوَلَا يَعْلَمُونَ
أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝

اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم
بھی ایمان لائے اور جب ایک دوسرے کے ساتھ
تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کیا اُن سے وہ
بیان کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولا ہے تاکہ وہ تم
پر اللہ کے سامنے دلیل بنالیں، کیا تم اتنا بھی نہیں
سمجھتے، کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ
چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ ﴿۸۲﴾

تفسیر

﴿۸۲﴾ اس آیہ مبارکہ میں یہودی منافقت کا ذکر ہے جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے
ہیں ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور جب یہ منافق یہودی اور دوسرے یہودی الگ محفلیں جماتے ہیں تو
دوسرے یہودی منافقین یہودیوں سے کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے
توراة میں تم پر کھول دی ہیں، تم ایسا کرتے رہے (اور وہ عبارات جو توراة میں حضور کے بارہ میں ذکر ہوئیں
وہ انہیں بتاتے رہے) تو مسلمان تم پر دلیل بنالیں گے اور تم کو مغلوب کر دیں گے، کیا تم یہ واضح بات بھی
نہیں سمجھ پاتے۔ جو یہود منافق نہیں تھے انہیں یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ منافقین
یہود کبھی نہ کبھی مسلمانوں کو خوش کرنے کیلئے تورات کی کوئی نہ کوئی بشارت سنا دیتے تھے جو دوسرے یہود کو
ناگوار گزرتی تھی اور انہیں ملامت کرتے تھے، یہود کو بتایا جا رہا ہے کہ تم کسی چیز کو (بشارت) کو چھپاؤ یا ظاہر
کرو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اگر منافقین مسلمانوں سے اپنا کفر چھپاتے ہیں اور یہود کا دوسرا گروہ حضور کی
بشارت چھپاتا ہے تو کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر چھپی اور ظاہر شے کو جانتا ہے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا
أَمْلًا وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۖ قَوْلٌ
لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ
ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا قَوْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كُتِبَتْ
أَيْدِيهِمْ وَقَوْلٌ لَّهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝

اور اُن میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو کتاب کو تو
جانتے نہیں، سوا جھوٹی خواہشات کے، اور وہ
صرف گمان ہی کرتے رہتے ہیں، اُن لوگوں کی
بربادی ہو جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں
اور پھر کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تا
کہ اس کے بدلے کچھ تھوڑا سا مفاد حاصل کر لیں
، ان کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ان کیلئے بربادی ہے اور
ان کی یہ محنت کمائی ان کیلئے تباہی ہے۔ ﴿۸۳﴾

تفسیر

﴿۸۳﴾ اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے اُس گروہ کا ذکر فرمایا ہے جو محض ان پڑھ لوگ
تھے، علم سے قطعی کوئی واسطہ نہ تھا۔ محض اپنی خواہشات پر مطمئن تھے، ایک معنی یہ بھی ہے کہ یہ لوگ توراۃ کے
الفاظ کو جانتے تھے مگر اس کے معنی سے بے خبر تھے، ان کی خواہشات میں یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے
گناہوں کو معاف کر دے گا اور ان کے جرائم کی سزا نہیں دے گا، ان کے انبیاء ان کی سفارش کر دیں گے،
اس سے پہلے یہود کے چار گروہوں کا ذکر ہے (۱) یہود کے بھٹکے ہوئے علماء (۲) یہود میں منافقین (۳)
منافقین یہود کے مخالف (۴) یہود کا اُن پڑھ طبقہ۔ اس چوتھے گروہ کو اُمّیون فرمایا گیا ہے یہ اُمّی کی جمع ہے
حضور ﷺ کا اُمّی ہونا دوسرے معانی میں ہے، (۱) ماں کو اُمّ کہا جاتا ہے کہ وہ اولاد کی اصل ہے،
حضور کائنات کے اصل ہیں (۲) مکہ کو ام القرآن کہا جاتا ہے اس لئے حضور کو اُمّی فرمایا گیا جیسے ملتانی،
لاہوری، قصوری وغیرہ (۳) سورۃ الفاتحہ کو ام الکتاب کہا جاتا ہے یہ سورہ حضور کو عطا ہوئی اس لئے اُمّی کہا

گیا (۴) اس لئے حضور کو اُمی فرمایا گیا کہ آپ نے دنیا کے کسی فرد سے علم نہیں پڑھا (۵) اگر حضور ﷺ کیلئے اُمی کا معنی ان پڑھ کیا جائے (معاذ اللہ) تو وہ کائنات کے معلم بن کر کیسے آئے؟

آیہ نمبر ۷۹ میں یہود کی ایک اور بد عملی ”تعصب اور خیانت“ کا ذکر کیا جا رہا ہے، تورات میں جہاں حضور ﷺ کی صفات مبارکہ تھیں انہیں بدل دیا تا کہ لوگ اُن پر ایمان نہ لے آئیں۔ حضور ﷺ کے حلیہ مبارک کو بدل دیا اور لوگوں سے کہتے، یہ رسول توراۃ والا تو نہیں وہ تو کوئی اور ہوگا۔ اس طرح سے لوگوں کو دھوکہ دیتے اور اسلام میں آنے سے روکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس فتنج حرکت پر عذاب کی خبر دی اور فرمایا توراۃ کو ہاتھوں سے بدل دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہی ہے اُن کا ایسا کرنا محض عارضی، مختصر مفاد ہے۔ ایسے لوگوں کیلئے خرابی ہے یا ویل ہے (ویل جہنم کا ایک طبقہ ہے) انہیں ان کی بد عملی کی سزا سنادی ہے، یہ بے ایمانی ہے، قوم سے دھوکہ ہے، دین فروشی ہے۔ (العیاذ باللہ)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور انہوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر صرف چند دن۔ (اے محبوب) آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے عہد لے رکھا ہے جس کی اللہ ہر گز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔ کیوں نہیں! جس نے برا کام کیا اور اس کو برائی نے گھیر لیا وہ جہنمی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے وہ جنتی ہیں، وہی

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً
قُلْ أَتُخَذُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ تُخْلَفَ
اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ۚ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً
وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۚ وَالَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۚ

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۸۴﴾

تفسیر

﴿۸۴﴾ چونکہ یہود اپنے عقیدہ میں سمجھتے تھے کہ حضور ﷺ کی آمد پر ان کا دین منسوخ نہیں ہوا، لہذا وہ مومن ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے انکار سے وہ کافر نہیں لہذا انہیں دوزخ کی آگ مس تک نہیں کرے گی۔ اگر کسی گناہ کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے تو گنتی کے چند دن وہاں رہیں گے پھر نکال لئے جائیں گے۔ ان کا یہ گمان محض غلط ہے اُن سے پوچھئے کیا اللہ تعالیٰ سے تم نے کوئی معاہدہ لے رکھا ہے؟ کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا (ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہاں عہد سے مراد کلمہ طیبہ ہے جو شخص خلوص دل سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے اور اس پر خاتمہ ہو اس سے بخشش کا وعدہ ہے، جب تم نے اسلام قبول ہی نہیں کیا تو بخشش کی امید کیسے رکھتے ہو) یا معاہدہ تو نہیں کیا ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا رہے ہو جس کی کوئی دلیل نہیں۔ جن لوگوں نے برائی کی اور پھر برائی نے ان کا احاطہ کر لیا وہ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ یہود نے حضور ﷺ کا انکار کر کے ایسی برائی کی ہے جس نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب وہ اس جرم کی پاداش میں ہمیشہ جہنم میں رہیں گے چونکہ حضور ﷺ کے انکار کے ساتھ کافر ہو گئے اور کفر وہ عمل ہے جس سے تمام نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی عمل صالح قبول نہیں ہوتا۔

اس آیت مبارکہ میں یہود کے اس نظریہ کی تردید کی گئی ہے جو انہوں نے کہا کہ اگر انہیں جہنم کی آگ نے مس کیا بھی تو صرف چند دن تک کرے گی، جتنے دنوں انہوں نے پھڑے کی پرستش کی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہود کہتے تھے دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کے مقابلہ میں ایک سال عذاب ہو گا یعنی ہم صرف سات سال عذاب میں رہیں گے۔ اس آیت پاک میں اُن کے نظریات کی تردید ہے فرمایا جا رہا ہے وہ اپنے کفر کے باعث ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۖ وَيَالُوَالِدِينَ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۸۵﴾

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا پھر تم (چند ایک کے سوا) سب پھر گئے اور تم ہی ہومنہ موڑنے والے۔ ﴿۸۵﴾

تفسیر

﴿۸۵﴾ اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک اور بے وفائی کا ذکر کیا ہے، انہیں ان کی بد عملی یاد دلانی جارہی ہے۔ اس وقت کو یاد کرو جب تم سے یہ پختہ وعدہ لے لیا گیا تھا کہ اللہ کی ہی عبادت کرو، ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں سے اچھا سلوک کرو، لوگوں سے بھلی بات کرو۔ پھر چند ایک کے سوا سبھی نے عہد توڑ دیا۔ اس آیہ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کچھ ایسی عبادات ہیں جو ہر نبی کے دور میں ہر امت پر لاگو ہیں، اللہ کی عبادت کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، ماں باپ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی باتیں کرنا، یہ ایسی عبادات ہیں جو ہر دور میں رہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد ہی ماں باپ سے حسن سلوک کا ذکر ہے جس سے والدین سے حسن سلوک کے ادب و احترام کا اہم ہونا واضح ہو رہا ہے، اس ضمن میں امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے جہاد کی اجازت طلب کی، آپ نے فرمایا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں، عرض کی ہاں یا رسول اللہ ﷺ، فرمایا ان کی خدمت میں کوشش کرو۔ ایک اور حدیث شریف سے اسی عنوان کی تائید اس طرح ملتی ہے حضرت جاہمہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی حضور میں نے جہاد کا ارادہ کیا ہے، مشورہ کیلئے

حاضر ہوا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا تیری والدہ زندہ ہے؟ عرض کی جی ہاں، فرمایا اس کے ساتھ چمٹے رہو، (یعنی خدمت کرتے رہو) جنت اس کے قدموں کے پاس ہے۔ (ابن ماجہ، نسائی)

اسی آیہ مبارکہ میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کا بھی ذکر ہے، بخاری شریف کی ایک روایت سے اس عنوان کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ ”جس شخص کو پسند ہو کہ اس کی عمر زیادہ ہو اور اس کے رزق میں برکت ہو تو وہ رشتہ داروں سے اچھے تعلقات رکھے“۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا جمعرات کو اولادِ آدم کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، رشتہ داروں سے تعلقات توڑنے والے کا عمل قبول نہیں ہوتا۔ (الترغیب ص ۳۴۳ ج ۳)

یتیم سے حسن سلوک کرنے کا ذکر ہے، حدیث شریف میں اس عنوان کی تائید اس طرح ملتی ہے حضور ﷺ نے اپنی دونوں انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا میں اور یتیم کے پالنے والا قیامت کے دن اس طرح ساتھ ساتھ ہوں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا بیوہ اور مسکین کی خدمت کرنے والا جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں لوگوں سے اچھی بات کرنے کا بھی حکم ہے۔ تبلیغ میں نرم کلامی کو بہت بڑی اہمیت ہے، موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تو حکم دیا گیا تھا کہ ”اس کیلئے نرم بات کرنا“۔ مخاطب مومن ہو یا کافر، بھلی بات کا حکم ہے کہ اسلام اخلاق، نرمی، بردباری کا دین ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی ایک دوسرے کو جلا وطن کرو گے اور پھر تم نے اقرار بھی کیا اور تم خود ہی گواہی دیتے ہو۔ ﴿۸۶﴾

وَلَا تَأْخُذْ بَاِصْبَاحِكُمْ اَلَا تَتَنَفَّكُوْنَ مِنْ مَّاءِكُمْ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ
اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۶﴾

تفسیر

﴿۸۶﴾ بنی اسرائیل سے پہلے جو وعدہ لیا گیا تھا اسی عنوان کا حصہ ہے کہ تم سے عہد لیا گیا تھا کہ خانہ جنگی، خون ریزی سے بچو گے اور پھر تم نے اقرار بھی کیا کہ ایسا نہیں کرو گے تم نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ایک دوسرے کو وطن سے نہیں نکالو گے، وطن سے نکالنے کا یہ معنی ہے کہ تم کسی پر مظالم نہیں کرو گے کہ وہ تمہارے ظلموں، نا انصافیوں سے تنگ آ کر وطن چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایسی فبیج حرکات نہ کرنا کہ تمہیں تمہاری بد اعمالیوں کے باعث جلا وطن کر دیا جائے، یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایسے اعمال سے بچنا کہ تم خود بھی دنیا سے اکتا جاؤ اور گھربار چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جاؤ، اگر تمہاری یہ صورت حال ہوگی کہ تمہیں قرار کیسے مل سکے گا اور تمہاری ہیبت کا سکھ کیسے جم سکے گا؟ تمہاری اس بے بسی سے تمہارے دشمنوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور انہیں تمہارا نیست و نابود کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا پھر تم نے اقرار بھی کر لیا کہ تم ان ہدایات پر عمل کرو گے اس اقرار پر تم گواہی بھی دے رہے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں فتنہ و فسادات قتل و غارت، ظلم و ستم سے بچنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ یہ عادات اچھے لوگوں کی نہیں یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ بد عہدی مومن کا شیوہ نہیں اسی آیت مبارکہ سے یہ بھی درس ہے کہ ثابت قدمی بڑی شئی ہے۔ یہود نے تورات میں لئے گئے اس وعدہ کی کھلی خلاف ورزیاں کیں

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ
فِرْيَاقًا مِّنْكُمْ مِّن دِيَارِهِمْ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ
بِالْإِثْمِ وَالْعُدَاوَةِ وَإِن يَأْتُواكُمُ الْبُرَى تَقْتُلُوهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ
الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَبِأَنَاءٍ مَّن يَفْعَلُ
ذَلِكَ مِّنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ
الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفَتْ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ ۝

پھر تم ہی وہ لوگ ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو
اور تم ایک فریق کو اپنے گھروں سے نکالتے اور تم ان
کے خلاف گناہ اور زیادتی میں مدد کرتے ہو، اگر وہ
قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو تم ان کا فدیہ
دیتے ہو حالانکہ ان کو گھروں سے نکالنا تم پر حرام کر
دیا گیا تھا کیا تم کتاب کے بعض حصہ کو مانتے ہو اور
بعض کا انکار کر دیتے ہو سو تم میں سے جو یہ کام
کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی
اور ذلت کے سوا کیا ہے اور قیامت کے دن سخت
عذاب میں وہ دھکیل دیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ
تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ
ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے
میں خرید لیا نہ ان سے عذاب کم کیا جائے گا اور نہ ہی
ان کی مدد کی جائے گی۔ ﴿۸۷﴾

تفسیر

﴿۸۷﴾ اس سلسلہ میں تین حکم تھے (۱) قتل نہ کرنا (۲) جلا وطن نہ کرنا (۳) قیدیوں کو
چھڑانا۔ انہوں نے پہلے دو حکموں پر تو عمل نہ کیا تیسرے کا اہتمام کرنے لگے۔ تفصیل یہ ہے مدینہ منورہ اور
اس کے گرد و نواح میں رہنے والے یہود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ یہود کے ایک قبیلہ کا نام بنو قریظہ تھا
اور دوسرے کا نام بنی نضیر۔ اس طرح مدینہ منورہ میں مشرکین کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک کا نام اوس تھا،

دوسرے کا نام خزرج تھا۔ بنو قریضہ اوس کے حلیف تھے اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے۔ ہر قبیلہ نے اپنے حلیف کے ساتھ قسمیہ معاہدہ کر لیا تھا کہ ہم پر کوئی حملہ کرے گا تو دوسرا اس کی مدد کرے گا۔ اب ان کی آپس میں شدید لڑائی رہتی تھی۔ بنی قریضہ، بنی نضیر کو اور بنی نضیر، بنی قریضہ کو قتل کرتے، جلاوطن کرتے، جب بنی قریضہ اوس کے ہاتھوں یا بنی قریضہ خزرج کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو وہ انہیں مال دے کر چھڑا لیتے۔ اگر عین جنگ کے وقت وہی شخص موقعہ پر آ جاتا تو اسے قتل کر دیتے۔

جب لوگ یہ کہتے کہ تم نے عجیب روش اختیار کر رکھی ہے قتل بھی کرتے ہو پھر خود ہی قید سے بھی بچاتے ہو تو کہتے ہمیں تو راۃ نے قیدیوں کے چھڑانے کا حکم دے رکھا ہے جب ان سے سوال ہوتا ہے اگر قیدی چھڑا لیتے ہو تو ان سے جنگ کیوں کرتے ہو تو کہتے ہیں اپنے حلیف کو ذلت سے بچانے کیلئے۔ اس آئیہ پاک میں ان کے اس فعل کی مذمت کی جا رہی ہے۔ اے یہود! تم نے عہد کیا تھا کہ جنگ نہیں کرو گے، جلاوطن نہیں کرو گے، اس قوم کے مقابل دشمن کو مدد نہیں دو گے یہ تو سب کچھ کر رہے ہو مگر قیدیوں کے چھڑانے میں بڑی دلچسپی ہے یہ کیوں؟ تو کہتے ہیں تو راۃ نے یہ حکم دے رکھا ہے ان کے اس کردار کی مذمت کی جا رہی ہے۔ کتاب کا کچھ حصہ مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔ تمہارا یہ کردار تمہیں رسوا کر دے گا چنانچہ ان کی رسوائی ہوئی۔ 3۔ ھ میں بنو قریضہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ بنو نضیر مدینہ منورہ سے نکال کر خیبر میں رکھے گئے پھر سیدنا عمر فاروق کے زمانہ میں وہاں سے بھی جلاوطن کر دیئے گئے۔

حضور ﷺ کا آنا ان کے لئے رحمت ثابت ہوا۔ اوس و خزرج کی سو سالہ جنگ ختم ہوئی انہیں ایمان نصیب ہوا۔ آیہ نمبر 86 میں فرمایا گیا ہے، اس کردار کے مالک لوگ جنہوں نے دنیا کے بدلے آخرت برباد کر دی وہ کس منہ سے کہتے ہیں کہ قیامت کو انہیں عذاب چند دن ہوگا پھر نجات پا جائیں گے ان کا یہ دعویٰ غلط ہے ان کے عذاب میں نہ تخفیف ہوگی نہ کسی قسم کی بچت اور نہ ہی ان کو کسی قسم کی مدد دی جائے گی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَفَقَيْنَا مِنْ بَعْدِهِ
بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ
وَآيَدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ
رَسُولٌ بِمَا لَا تَخَوُّوْنَ أَنْفُسَكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ
فَعَرِيقًا كَذَبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۚ وَ
قَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ
فَلَقِيلَ لَا يَأْتِيَنَّوْنَ

اور بے شک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی
اور ان کے پیچھے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم
(علیہ السلام) کو واضح دلائل دیے اور ہم نے روح
القدس سے ان کی تائید کی تو کیا ہر بار ایسا نہیں ہوا کہ
جب بھی رسول تمہارے پاس پیغام لے کر آیا جو تمہاری
مرضی کا نہ تھا تو تم نے تکبر کیا (رسولوں کے) ایک گروہ
کی تم تکذیب کرتے تھے اور ایک کو تم قتل کرتے تھے
یہود نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں بلکہ ان کے
کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ان میں
بہت تھوڑے ایمان لائے ہیں۔ ﴿۸۸﴾

تفسیر

﴿۸۸﴾ اس آیہ مبارکہ میں بنی اسرائیل پر ایک اور عظیم احسان کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل! ہم نے
تمہاری ہدایت کے لئے کیا کچھ نہ کیا موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا کہ تمہاری اصلاح ہو پھر ان کے
بعد یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام بھیجتے رہے کہ تم راہ راست پر آؤ۔ پھر اسی بنی اسرائیل کے ایک اور عظیم
نبی عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کو کھلے کھلے واضح دلائل دے کر بھیجا کہ اصلاح پر آ جاؤ اور پھر ہم نے عیسیٰ
علیہ السلام کی حمایت روح القدس سے کی یہ بھی ایک بڑی بات تھی یہ حیرت نہیں کہ تم پھر بھی سرکشی ہی کرتے
رہے اور جب کبھی کوئی رسول ایسا حکم لے کر آیا جو تمہیں پسند نہ تھا، تم نے تکبر کیا۔ صرف یہی نہیں تم نے تو
انبیاء علیہم السلام کو قتل بھی کیا اس آیہ مبارکہ میں ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تائید روح القدس سے کی گئی اس
کی کئی صورتیں تھیں۔

- 1- عیسیٰ علیہ السلام کو ولادت کے وقت شیطان کے مس کرنے سے بچایا گیا۔
 - 2- جبرائیل علیہ السلام کی پھونک سے حضرت مریم کو حمل قرار پایا۔
 - 3- یہود سے بچانے کے لئے جبریل عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے۔
 - 4- یہود سے محفوظ کرنے کے لئے عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھالیا گیا۔
- عیسیٰ علیہ السلام کو بیسٹا دینے کا ذکر ہے اس سے مراد ان کے وہ مشہور معجزات ہیں۔ کوڑھی کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور مادر زاد اندھے کو بینا کرنا۔ یہود نے بہت سے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، عیسیٰ علیہ السلام کو بھی جھٹلایا حالانکہ وہ بنی اسرائیل کے عظیم فرد تھے، زکریا و یحییٰ علیہم السلام کو قتل کیا (معاذ اللہ) یہود طغر کے طور پر کہتے تھے کہ ہمارے دل پردوں میں محفوظ ہیں، مخالف مذہب کا اثر نہیں ہوتا۔ فرمایا ایسا نہیں بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت ہے کہ اسلام سے دور ہیں۔ نصاریٰ تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں ان کی کچھ باتیں مشترک ہیں مثلاً خدا کو ماننا حقانیت کا اقرار مگر چونکہ حضور ﷺ کی نبوت کے قائل نہ تھے اسلئے ان کا ایمان پورا نہ تھا اور ان کی نجات کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان لاتے۔ یہاں پر ایمان سے مراد ان کا تھوڑا سا یقین ہے۔ ان آیات مبارکہ میں حضور ﷺ کے لئے تسلی دی جارہی ہے کہ محبوب یہود کا آپ کو نہ ماننا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ لوگ تو انبیاء علیہم السلام کے پرانے دشمن آرہے ہیں انبیاء کو جھوٹا کہنا ان کی پرانی عادت ہے۔
- وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے اور وہ اس سے پہلے (حضور کے وسیلہ سے) کفار کے خلاف فتح کی دعا کیا کرتے تھے اور جب ان کے پاس وہ آگئے جنہیں وہ جان پہچان چکے تھے (یعنی حضور ﷺ) تو انہوں نے ان کے ساتھ کفر کیا (ان کی نبوت کا انکار کر دیا) کافروں پر اللہ کی لعنت ہو۔ ﴿۸۹﴾

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ قَاعَرُوا كَفَرُوا بِهِمْ فَلَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۸۹﴾

تفسیر

﴿۸۹﴾ اس آیہ مبارکہ میں یہود کی ایک اور حالت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ امام ابو نعیم علیہ الرحمہ نے دلائل النبۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ کی آمد سے قبل یہود کے مشہور قبائل بنو قریظہ، بنو نضیر کفار کے خلاف جنگ میں اللہ تعالیٰ سے حضور ﷺ کے وسیلہ سے یوں دعا کیا کرتے تھے۔ ”اے اللہ! ہم نبی امی کے وسیلہ سے تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں، تو ہماری مدد فرما۔“ اور جب حضور ﷺ جلوہ فرما ہو گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کا ذکر تورات نے کیا ہے اور اس گروہ یہود کا لیڈر سلام بن مشکم تھا جو یہ کہتا تھا کہ یہ وہ نبی نہیں اس کی اقتداء میں دوسرے بھی کہتے تھے۔ کتب سابقہ میں حضور ﷺ کی بشارات مقدسہ کا مطالعہ مطلوب ہو تو اس فقیر کی کتاب جلوہ جاناں حصہ اول کا مطالعہ مفید رہے گا میں نے کوشش کر کے اس دور کی سیرۃ النبی ﷺ پر لکھی گئی بہت سی کتابوں سے بہت زیادہ بشارات درج کی ہیں۔ (وللہ الحمد)

یہود کے جان پہچان کے بعد حضور ﷺ کے انکار پر انہیں لعنتی فرمایا گیا ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں قرآن مقدس کو تورات کی تصدیق کرنے والی کتاب فرمایا گیا ہے۔ تورات کے ماننے والا تو قرآن مقدس کی تکذیب کر ہی نہیں سکتا مگر یہود کی ہٹ دھرمی تھی۔

اس آیہ مبارکہ پر یہ سوال درست نہ ہوگا کہ جب یہود نے حضور کو پہچان لیا تو یہ کفر کیسے ہو گیا یہ تو ایمان ہے۔ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں بلکہ دل سے ماننے کا نام ہے اسی بناء پر انہیں کافر فرمایا گیا۔ ان یہود سے مراد یہی یہود ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے یہود کی ضد وہٹ دھرمی کا ذکر ہے کہ ان سے ایمان کی توقع فضول ہے انہیں تو چاہئے تھا کہ قرآن مقدس پر ایمان لے آتے کہ قرآن پاک نے تو ان کی تصدیق کی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

بَشَمَا اشْتَرَوْا بِهِ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَكْفُرُوا بِمَا
اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ
عَلٰى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادٍ ذٰلِكَ وَبِغَضَبٍ
عَلٰى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝۹۰

کتنی بری چیز ہے وہ جس کے بدلے میں انہوں نے
اپنی جانوں کو فروخت کیا کہ وہ اس کتاب کا کفر کریں
جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اپنے فضل سے، اس ضد پر
کہ اتارے اللہ جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، وہ
غضب در غضب میں لوٹے اور کفار کے لئے ذلیل
و خوار کرنے والا عذاب ہے۔ ﴿۹۰﴾

تفسیر

﴿۹۰﴾ ان کی وہ حالت بہت ہی خراب ہے جس کو اختیار کر کے اپنی جانوں کو عذاب آخرت
سے بچانا چاہتے ہیں اور ان کی وہ حالت یہ ہے وہ ایسی چیز کا کفر کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ
پر اتارا، وہ کتاب قرآن مقدس ہے۔ ان کا یہ انکار محض اور محض اس ضد پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل
سے اپنے پسندیدہ بندے پر کیوں نازل فرمایا، اس حسد سے وہ لوگ غضب بالائے غضب کے حقدار ہو گئے
ہیں اور آخرت میں انہیں ایسی سزا ہوگی جس میں انہیں عذاب کے علاوہ ذلت بھی ہوگی۔ ان پر دوسرا غضب
اس لئے ہوگا کہ ایک غضب تو ان کے کفر پر اور دوسرا غضب ان کے حسد پر۔ ان کے عذاب کے متعلق فرمایا
گیا کہ انہیں اس عذاب سے ذلت بھی ہوگی مومن اور کافر کے عذاب میں یہ فرق ہے مومن کو عذاب ہوگا تو
اسے پاک کرنے کے لئے ہوگا کافر کو عذاب ہوگا تو اسے ذلیل کرنے کے لئے۔

اس ارشاد گرامی سے واضح ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل حسد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے
تھے جس سے حسد، سرکشی کی مذمت ثابت ہو رہی ہے۔ یہود کو یہ حسد تھا کہ خدا تعالیٰ اپنی مرضی سے جس پر
چاہے وحی اتار دیتا ہے ان کے خاندان بنی اسرائیل ہی کو خاص کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے جانیں دے کر جو
کچھ خرید اوہ حضور ﷺ کے ساتھ حسد اور عناد تھا اور یہ سودا انہیں مہنگا پڑا کہ آخرت میں عذاب، ذلت اور

رسوائی سے دوچار ہوں گے کہ کفر کے بدلے ایمان فروخت کر ڈالا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ أُنْزِلَ لَهُمُ الْبُحُرُ الْوَيْدُ أَنْزَلَ اللَّهُ الْقُرْآنَ
نُورًا مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَخَلْفَهُمْ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ
كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان تمام کتابوں
پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں تو
کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائیں گے جو کچھ ہم پر
نازل ہوا اور اسکے علاوہ کافر کرتے ہیں حالانکہ
وہ حق ہے اور جو کتاب ان کے پاس ہے اس کی
تصدیق کرنے والا ہے آپ کہہ دیجیے اگر تم توراہ
پر ایمان رکھتے ہو تو پہلے انبیاء علیہم السلام کو قتل
کیوں کرتے تھے۔ ﴿۹۱﴾

تفسیر

﴿۹۱﴾ جب حضور ﷺ نے یہود سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتاری گئی تمام کتابوں پر ایمان لاؤ تو
انہوں نے کہا ہم تو صرف موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی کتاب توراہ پر ایمان لائیں گے اور قرآن مقدس کا
گھلا انکار کر دیا۔ اس آیہ مبارکہ میں ان کا رد ہے کہ قرآن بھی تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور قرآن پاک توراہ
کی تصدیق کرتا ہے اس پر بھی ایمان لاؤ۔ پھر یہود کے اس دعویٰ کی تردید بھی ہے کہ وہ توراہ پر ایمان رکھتے
ہیں اگر واقعی تم توراہ کو مانتے ہو تو انبیاء علیہم السلام کو قتل کیوں کرتے تھے؟ ایسا کرنا تو توراہ کی کھلی بغاوت
ہے۔ گویا اس آیہ مبارکہ میں یہود کے دعویٰ ایمان کا تین دلیلوں سے رد فرمایا گیا ہے۔

☆ پہلی بات یہ کہ اُن کا یہ کہنا کہ جو کچھ اُن پر نازل ہوا ہے اس کے سوا کسی اور کو نہ مانیں گے یہ کہنا

ان کے بغضِ حسد کی واضح دلیل ہے

☆ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مقدس کا انکار تو واضح طور پر تورات کا انکار ہے اس لئے کہ قرآن پاک نے توراۃ کی تصدیق کی ہے یہ انکار ان کی کھلی جہالت ہے۔

☆ تیسری بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دشمنی، ان کا قتل تو تمام آسمانی کتابوں میں کفر بتایا گیا ہے، پھر تمہارے اکابرین نے انبیاء علیہم السلام کو بے دریغ قتل کیا اور تم ان کی اس حرکت کو مبارک اور مقدس سمجھتے ہو تمہارا ایسا تصور تمہیں ان کے قتل میں شریک کرتا ہے تمہارا ہر عمل توراۃ کی کھلی بغاوت ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ
وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۹۲﴾
اور تمہارے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلے دلائل
لے کر آئے پھر تم نے پھڑپھڑے کو (معبود) بنا لیا
اور تم ظالم تھے ﴿۹۲﴾

تفسیر

﴿۹۲﴾ اس آیہ مبارکہ میں موسیٰ علیہ السلام کو معجزات دے کر بھیجے اور پھر ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے یہود کے انکار کا ذکر ہے۔ قرآن مقدس نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا ہے ”وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ“ اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو (۹) واضح نشانات دیئے۔ بنی اسرائیل کے اس عظیم نبی کو نو معجزات عطا فرمائے گئے۔ (سید الانبیاء ﷺ کے مقدس معجزات کا سرسری جائزہ لینے کیلئے اس فقیر کی کتاب مہمۃ الرسول اور جلوۂ جانان کا مطالعہ مفید رہے گا)۔ وہ نو (۹) نشانیاں یہ تھیں۔ (۱) موسیٰ علیہ السلام کا عصا (۲) ید بیضا (۳) زبان کی لکنت کو دور کرنا (۴) بنی اسرائیل کے لئے سمندر میں راستہ بنانا (۵) ٹڈیوں کی صورت میں عذاب (۶) طوفان (۷) کپڑوں میں جوؤں کا پیدا ہو جانا (۸) مینڈکوں کا عذاب (۹) خون کا عذاب مگر ان واضح اور کھلی نشانیوں کا بھی انکار کر

دیا اور پچھڑے کی پرستش شروع کر دی یہود پر یہ رد ہے کہ اگر تم تورات کے ماننے والے ہوتے تو پچھڑے کی پرستش کیوں کرتے؟

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَنشَرُونَا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ يَسْمَايَا مَرَّكُمْ بِهِ إِنَّمَا كُنْتُمْ مَوْمِنِينَ ﴿۹۳﴾

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور طور پہاڑ کو تم پر اٹھایا (اور حکم دیا) جو ہم نے تمہیں دیا اسے مضبوطی سے لو اور سنو انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی، ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں پچھڑا بسا دیا گیا آپ کہیے اگر تم (تورات پر) ایمان لانے والے ہو تو یہ کیسی بری چیز ہے جس کا تمہیں ایمان حکم دیتا ہے۔ ﴿۹۳﴾

تفسیر

﴿۹۳﴾ اس آیہ کریمہ میں یہود پر ایک اور رد ہے کہ اگر تم توراۃ پر ایمان رکھتے تھے تو تم سے احکام منوانے کے لئے تمہارے سروں پر طور پہاڑ کو اٹھایا کیوں گیا؟ پھر جب تم سے کہا گیا کہ توراۃ کو مانو، اس کے احکام کی پابندی کرو تو تم نے کیسا جواب دیا کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ یہ ساری باتیں تو حضور ﷺ کے زمانہ سے پہلے یہودیوں کی تھیں مگر حضور ﷺ کے زمانہ کے یہود نے اپنے بڑے لوگوں کے برے کاموں سے نفرت کا اظہار نہیں کیا لہذا خطاب انہیں ہوا، اس طبقہ نے پہاڑ کو سر پر اٹھا دیکھ کر زبان سے تو کہہ دیا تھا کہ ہم نے سن لیا مگر تمہارے دل کہہ رہے تھے کہ نافرمانی کریں گے۔ شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے۔ تمہارے ظاہری طور پر کہنے سے پہاڑ کو ہٹا دیا گیا اے محبوب! (ﷺ) انہیں فرمادیں کیا یہ ایمان ہے جو تم سے ایسی بری حرکتیں کراتا ہے، نہیں یہ ایمان نہیں۔ اگر تم مومن تھے تو ایسی قبیح حرکات کیوں کیں

؟ یہود کے اس دوہرے رویہ کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دلوں میں پھڑے کی محبت رچ بس چکی تھی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

آپ کہہ دیجئے اگر دار آخرت اللہ کے نزدیک اور لوگوں کے بجائے خاص طور پر تمہارے لئے ہی ہے تو پھر اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو اور جو اعمال پہلے کر چکے ہیں وہ ان کی وجہ سے موت کی خواہش ہرگز نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ﴿۹۴﴾

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَنْ يَتَمَنَّوَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْهِمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

تفسیر

﴿۹۴﴾ یہودیوں کا ایک گروہ بہت دعوے سے کہتا تھا کہ آخرت کی ساری نعمتیں سارے اعزاز صرف اور صرف انہیں کیلئے ہی ہیں کوئی دوسرا طبقہ ان انعامات کا حقدار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے فرمایا کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو اور جلد ان مقامات کو حاصل کرو۔ مگر وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے کہ انہیں پتہ ہے جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے اللہ تعالیٰ کو ظالموں کی حالت کا اچھی طرح علم ہے۔

ان کا یہی دعویٰ قرآن مقدس نے دوسری جگہ پر اس طرح فرمایا ہے انہوں نے کہا چونکہ ہم دین حق پر ہیں ہمیں نجات ضرور ملے گی اگر کوئی گنہگار ہوا تو چند دن سزا کے بعد جنت میں چلا جائے گا۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا ”نحن ابناء الله واحباؤه“ ”ہم تو اس کے بیٹے ہیں اور دوست ہیں“ ان کے دعویٰ کی تردید اس طرح فرمائی گئی کہ اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو مگر وہ ایسی تمنا ہرگز نہیں کریں گے۔

چنانچہ اس اعلان کے بعد یا تو مسلمانوں کی ہیبت طاری ہو گئی یا ڈر گئے کہ اگر خواہش کر لی اور موت آ گئی تو سیدھے جہنم جائیں گے۔ بہر حال انہوں نے یہ خواہش نہ زبانی کی نہ دل سے کی۔ ان کا اس اعلان کے جواب میں خاموش رہنا اسلام کے حق ہونے کی واضح دلیل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر وہ ایک دن بھی موت کی تمنا کرتے تو روئے زمین پر ایک یہودی بھی زندہ نہ رہتا اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہوتے تو موت کی خواہش کر کے اپنی برتری ثابت کر سکتے تھے مگر ایسا نہ کر سکے۔

اس واقعہ سے قرآن مقدس کی صداقت واضح ثابت ہو رہی ہے، اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان سچے ہیں تو وہ موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔ اسلام نے مشکلات سے گھبرا کر موت کی تمنا کو منع فرمایا ہے اور اللہ کی ملاقات اور جنت کے لئے جائز فرمایا ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس طرح دعا کی ہے ”اے اللہ مجھے اپنی راہ میں شہادت عطا فرما اور اپنے رسول ﷺ کے شہر میں میری موت واقع فرما“۔ بخاری شریف میں حضور ﷺ کا اپنا ارشاد اس طرح ملتا ہے میں چاہتا ہوں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔

(بخاری شریف ج 1 ص 392)

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ
اور آپ ضرور دیکھیں گے کہ وہ لوگ اوروں کی
نسبت زندگی پر زیادہ حریص ہیں اور مشرکوں سے
بھی زیادہ حریص ہیں ان میں ہر ایک چاہتا ہے کہ
اس کی عمر ہزار سال ہو اگر اسے عمر مل بھی جائے تو
اسے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں جو کچھ وہ کر
رہے ہیں خدا دیکھ رہا ہے۔ ﴿۹۵﴾

وَلْيَجِدَ تَهُمَ أَخْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوةٍ
وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يُوْذُوْا اَحَدَهُمْ لَوْ يَعْتَرُوْهُ
اَلْفَ سَنَةٍ وَّمَا هُوْا بِزَحٰزِحَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ
اَنْ يُّعْتَرَوْا بِاللّٰهِ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

تفسیر

﴿۹۵﴾ اس آیہ کریمہ میں بھی ان کے اس غلط دعویٰ کا رد ہے حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ محبوب یہ موت کی تمنا کیا خاک کریں گے آپ انہیں دنیا کی زندگی کا حریص پائیں گے یہ تو بعض مشرکین سے بھی بڑھ کر زندگی کے حریص ہیں۔ مشرکین اگر لمبی عمر کی تمنا کریں تو عجیب نہیں کہ وہ تو آخرت کے قائل ہی نہ تھے مگر یہود جو آخرت کے قائل ہیں اور اپنے جنتی ہونے کے دعویدار ہیں ان کا موت کی تمنا نہ کرنا اور لمبی زندگی کی خواہش کرنا باعث تعجب ہے۔ یہود کا لمبی عمر کا چاہنا بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے فیصلوں کو اپنے خلاف سمجھ رہے ہیں کہ ان کا کردار ان کے سامنے ہے جس کے بدلہ میں انہیں اپنی سزا کا پورا یقین ہے۔ یہ اپنی زندگی پر ایسے حریص ہیں کس قدر ہی مصیبت میں کیوں نہ ہو جینے کی تمنا ہی ان کا سہارا ہے اور وہ اپنی حماقت کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ رہے کہ لمبی عمر انہیں آخرت کے عذاب سے بچانہ سکے گی جب موت ایک یقینی امر ہے تو 50 سال ہو یا 100 سال اس کے بعد آخر موت ہی ہے۔

اس ارشاد سے یہ بھی واضح ہے کہ دنیا کی محبت میں گم ہو جانا اچھا طریقہ نہیں۔ قرآن مقدس نے دین اور دنیا دونوں کی اچھائی مانگنے کا راستہ دکھایا ہے اور وہی صحیح راستہ ہے۔ حصول دنیا کے لئے لمبی عمر کی تمنا، آوارگی اور خلاف شریعت حصول مال کی خواہش گمراہی کے راستے ہیں البتہ دینی خواہشات کی تکمیل کیلئے لمبی عمر کی تمنا اس زمرے میں شمار نہیں ہوگی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ
 قَلِيلًا بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
 وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ مَنْ كَانَ
 عَدُوًّا لِلَّهِ وَلِآلِهِ وَلِجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ
 فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ۝ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ
 آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۝

آپ کہہ دیجئے جو شخص جبریل کا دشمن ہے (تو رہے
) پس بے شک جبریل نے اللہ کے حکم سے آپ کے
 دل پر قرآن اتارا ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق
 کرنے والا اور مؤمنین کیلئے ہدایت (ہے) اور
 بشارت ہے جو شخص اللہ کا اس کے فرشتوں کا اس کے
 رسولوں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا دشمن ہے پس بے
 شک اللہ کافروں کا دشمن ہے اور بے شک (اے
 رسول) ہم نے آپ پر واضح آیات نازل کیں اور ان
 آیتوں کا صرف فاسق ہی انکار کرتے ہیں۔ ﴿۹۶﴾

تفسیر

﴿۹۶﴾ اس آیہ کریمہ میں حضور ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے اے محبوب کریم یہود کی مخالفت اور
 دشمنی سے پریشانی کا ہے کی۔ ان کی حماقت اور ضد تو یہاں تک ہے کہ یہ جبریل سے دشمنی کرتے ہیں کہ
 اس نے آپ پر یہ قرآن اتارا کیوں؟ جب حضور ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تھے یہود کا ایک
 لیڈر عبداللہ ابن صمد یا تحقیق کی غرض سے حضور کی بارگاہ میں آیا کہ پتہ کرے یہ وہی آخری نبی ہے جس کا ذکر
 کتب میں آیا ہے۔ اس نے کئی ایک سوال کیے، حضور ﷺ اسے جوابات دیتے گئے اس کا ایک سوال یہ تھا
 کہ آپ پر وحی کون لاتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا جبریل اور یہی جبریل پہلے انبیاء پر بھی وحی لاتے تھے۔ تو
 ابن صمد یا نے کہا اب ہم ایمان نہیں لائیں گے کہ جبریل تو ہمارا پرانا دشمن ہے، نبوت و رسالت ہمارے
 خاندان سے خاص تھی اس نے بنی اسماعیل کو دے دی ہمارے پہلوں پر عذاب لانے والا یہی ہے۔ اگر
 میکائیل آپ پر وحی لاتے تو بات اور تھی کہ میکائیل رحمت اور بارش لاتے ہیں۔

ابن صمدیا کے سوالات اور حضور ﷺ کے جوابات کے بعد یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی ان سوالات و جوابات کی تفصیل مطلوب ہو تو روح البیان، تفسیر کبیر میں اسی مقام کا مطالعہ مفید رہے گا۔ آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور رسولوں، جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ ابن صمدیا نے ایک مقام پر یہ کہا کہ آپ پر کوئی واضح دلیل نہیں اُتری جسے دیکھ کر ہم ایمان لے آئیں تو اس آیہ (99) میں جواب فرمایا گیا محبوب! ہم نے آپ پر کھلی نشانیاں اتاری ہیں مگر فاسق لوگ انکار کر رہے ہیں۔ صاحب تفسیر کبیر نے یہ بات بھی نقل کی ہے کہ ایک موقع پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے یہود سے فرمایا کہ تم حضور ﷺ کی آمد سے پہلے تو آپ کے بڑے بڑے واقعات سنایا کرتے تھے اور اب اُن کی آمد پر انکار کر رہے ہو۔ تو کہتے تھے توراۃ کی بتائی ہوئی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں لائے۔ تو یہ فرمایا محبوب ہم نے آپ پر کھلی نشانیاں اتاری ہیں مگر فاسق انکار کر رہے ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس قول کا جواب دیا ہے کہ وہ جبریل کے مخالف ہیں فرمایا گیا جو جبریل کا دشمن ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بھی دشمن ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہی وحی دے کر بھیجا ہے اور جو جبریل کا دشمن ہوگا وہ سارے فرشتوں کا دشمن ہوگا کہ سارے فرشتے جبریل کے موافق ہیں اور جو جبریل کا دشمن ہوگا وہ سارے رسولوں کا بھی دشمن ہوگا، وہ میکائیل کا دوست بھی نہیں ہو سکتا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

کیا یہ صحیح نہیں کہ جب بھی (یہ لوگ) کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اسے پس پشت ڈال دیتا ہے بلکہ ان میں اکثر ایمان نہیں لاتے اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول (محمد ﷺ) آئے جو تصدیق کرنے والے ہیں اس شئی کی جو اُن کے پاس ہے (آسمانی کتابیں) تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے (توراۃ) کو اس طرح پس پشت پھینکا (پرواہ نہ کی، دھیان نہ دیا) گویا انہیں کچھ علم ہی نہیں۔ ﴿۹۷﴾

أَوْ كَلَّمَا عَهْدًا وَعَهْدًا بُدِّلَ مِنْهُمْ
بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۚ وَلَكِنَّا جَاءَهُمْ
رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ
نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
كِتَابَ اللَّهِ وَرَأَوْا ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ ۚ

تفسیر

﴿۹۷﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب حضور ﷺ جلوہ گر ہوئے تو آپ ﷺ نے یہود سے لئے گئے عہد کا ذکر فرمایا تو اس پر ایک یہودی عالم مالک بن صیف نے کہا اللہ کی قسم! اللہ نے ہم سے کسی قسم کا عہد و میثاق نہیں لیا تو یہ حکم نازل ہوا کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم جب بھی کوئی عہد کرتے ہو، تو اسے پس پشت ڈال دیتے ہو بلکہ اکثر ایمان ہی نہیں لاتے حالانکہ حضور ﷺ توراۃ کے عام عقائد، توحید، رسالت، جزا و سزا اور رسولوں کی تصدیق فرماتے ہیں۔ اس صورت میں قرآن مقدس کا نہ ماننا تو توراۃ کا بھی کھلا انکار ہے ان کے توراۃ کو پس پشت ڈالنے کا یہ معنی نہیں کہ انہوں نے ساری کتاب کا انکار کر دیا بلکہ وہ آیات و نشانات جو حضور ﷺ کے بارے میں تھے، انہیں نہ ماننا یا غلط تاویلات کیں، معافی بدل دیئے کہ یہ نشانات حضور پر منطبق نہیں ہوتے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ساری توراۃ کے منکر ہو گئے تو بھی صحیح ہے کہ کتاب الہی کے کسی حصہ کا انکار ساری کتاب کا انکار ہی ہوتا ہے۔ شریعت کے کسی بھی قانون کا انکار تمام قوانین کا انکار ہی شمار ہوگا کہ شریعت کا نظام وحی الہی سے ہے اور ایک وحی کا انکار سبھی کا انکار ہوگا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ
وَمَا كَفَرُوا بِسُلَيْمَانَ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا
يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السَّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَائِكَةِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يَعْلَمَنِ
مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ قَتْلٌ فَلَا
تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ
الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَهَاسِمٌ إِضَارِيْنِ بِهِ مِنْ أَحَدٍ
إِلَّا يَأْذِنُ اللَّهُ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ
وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ
كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَنُثَبِّتَهُنَّ
فَمِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

اور انہوں نے (اس جادو کے کلمات کفریہ) کی
پیروی کی جس کو سلیمان (علیہ السلام) کے دور
حکومت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور سلیمان
(علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا لیکن شیطان ہی کفر
کرتے تھے، لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور انہوں
نے اس جادو کی پیروی کی جو بابل شہر میں دو فرشتوں
ہاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا اور وہ (فرشتے) کسی
کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہتے کہ ہم تو
صرف آزمائش ہیں، تم کفر نہ کرو اور وہ اُن سے وہ
سیکھتے تھے جس کے ذریعہ مرد اور بیوی کے درمیان
علحدگی کر دیتے اور اللہ کی اجازت کے بغیر اس جادو
کے ذریعہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور اُس چیز کو
سیکھتے جو انہیں نقصان پہنچائے اور نہ نفع دے اور بے
شک وہ خوب جانتے تھے کہ جس نے اس (جادو) کو
خرید لیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور ضرور بُرا
ہے وہ جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو
فروخت کر ڈالا کاش یہ جان لیتے اور اگر یہ ایمان لے
آتے اور متقی بن جاتے تو اللہ کے پاس ثواب بہت
بہتر ہے کاش یہ جان لیتے ﴿۹۸﴾

تفسیر

﴿۹۸﴾ جس طرح گزشتہ آیات میں یہود کے کئی بُرے کاموں کی مذمت کی گئی۔ اس آیت پاک میں بھی

ان کی ایک اور برائی کا ذکر ہے۔ یہودی علماء حضور ﷺ پر حیرت اور تعجب کرتے کہ یہ سلیمان کو بھی مانتے ہیں حالانکہ وہ تو صرف جادوگر تھے (معاذ اللہ)۔ اُن کی تردید میں یہ آیہ پاک نازل ہوئی اور سلیمان علیہ السلام کے متعلق واضح حکم دیا گیا کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر شیاطین نے کفر کیا۔

اس واقعہ کی قدر تفصیل یہ ہے کہ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے جن، شیاطین آسمان پر جاتے اور فرشتوں کی باتیں سنتے پھر واپس آ کر پنڈتوں، کاہنوں، نجومیوں کو جھوٹ موٹ ملا کر سناتے اور پھر وہ آگے لوگوں کو بتاتے اس طرح سے اُن کے حیران کن کاموں کا چرچا ہوتا گیا۔ اور اُن کا منتر جنتز کا مشغلہ عروج پکڑتا گیا اور ان کے منتروں میں کلمات کفریہ بھی شامل ہوتے تھے، آہستہ آہستہ یہ مشغلہ عام ہو گیا اور لوگوں نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ جب یہ باتیں سیدنا سلیمان علیہ السلام تک پہنچیں تو آپ نے آصف بن برخیا کو حکم دیا کہ انسانوں اور شیطانوں کی ملاقات پر پابندی لگا دی جائے کہ شیاطین انسانوں کو گمراہ نہ کر سکیں اور منتر جنتز اور جادو کی ساری کتابیں اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیں۔

سیدنا سلیمان علیہ السلام کے وصال کے بعد شیطان انسانی شکل میں یہود کے پاس آیا اور انہیں بہکایا کہ سلیمان علیہ السلام کی اتنی بڑی بادشاہت کا راز وہ کتابیں تھیں جو تخت کے نیچے دفن کرادی گئی ہیں اگر تم بھی وہ نکال کر عمل شروع کر دو تو تم بھی بادشاہت کرنے لگ جاؤ گے۔ یہود نے وہ کتابیں نکال لیں اور منتر جنتز شروع کر دئے، شیطان مداخلت کر کے ان کے کام کراتا رہا اور آہستہ آہستہ یہ قوم یہود توہمات، جادو اور منتروں میں پھنستی چلی گئی، یہاں تک کہ تورات سے منہ موڑ لیا اور گمراہی کے گہرے گڑھے میں جا گری۔ سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا، جادوگر کہا، کافر کہا، (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر نبی سلیمان علیہ السلام کی برأت فرمائی۔ جہاں اس آئیہ کریمہ میں سلیمان علیہ السلام کی عظمت کا ذکر ہے وہاں یہود کی تاریک زندگی کا ایک واضح پہلو بھی ہے۔ جب کوئی قوم پستی میں گرتی ہے تو اپنے بزرگوں کے خلاف زبان درازی پر اتر آتی ہے جیسے یہود نے سلیمان علیہ السلام کے خلاف کیا، اہل اللہ کی مخالفت

گہرے اندھیروں میں ڈال دیتی ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی مخالفت یہود کی تباہی و بربادی کا باعث بن گئی۔ یہود نے سلیمان علیہ السلام پر کئی الزامات عائد کئے (معاذ اللہ) آپ کی حکومت، بادشاہت میں نبوت کا بھی ذکر ہوتا مگر یہ بھی کہتے کہ آخر عمر میں سلیمان علیہ السلام نے توحید کو چھوڑ دیا تھا اور اپنی مشرک بیویوں کے باطل خداؤں کی پرستش کرتے تھے (معاذ اللہ)

بائبل میں سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں کھلی کھلی باتیں درج ہیں جو منصب نبوت کے منافی ہیں اسلام اور عیسائیت میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ اسلام نے انبیاء علیہم السلام کو معصوم فرمایا ہے جبکہ عیسائیت میں نبی کا یہ مقام نہیں۔ سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں بائبل نے لکھا ہے وہ آخری عمر میں اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا تھا (خدا پناہ) اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا تھا، سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی، خداوند سلیمان سے ناراض ہوا کہ اس کا دل خداوند سے پھر گیا تھا۔ (اس عنوان پر مزید مطالعہ مطلوب ہو تو سلاطین باب ۱۱ کا مطالعہ کریں)

قرآن مقدس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جادوگر اور کافر ہونے کے الزام کو مسترد کیا، قرآن مقدس کے اس اعلان حق کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر یہود و نصاریٰ کے لکھے پڑھے لوگوں کو ماننا پڑا کہ سلیمان علیہ السلام بت پرستی، برائی، بے حیائی سے محفوظ تھے اور اللہ کے سچے نبی تھے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

سحر کیا ہے؟

سحر (جادو) ایسا عمل ہے جس میں شیطان کا تقرب حاصل کر کے اس کی مدد سے کوئی کام کیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے سحر کی یہ تعریف کی ہے کہ کسی چیز کو اس کی حقیقت سے دوسری حقیقت میں بدل دینا سحر کہلاتا ہے۔ یا خلاف عادت کسی شی کا ہو جانا اگر وہ نبی کے ذریعہ سے ہو تو معجزہ کہلاتا ہے، اگر ولی کے ذریعہ سے ہو تو کرامت ہے اگر یہ صورت کسی کافر کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہو تو جادو ہے۔ نظر بندی اور تخیلات پر

بھی لفظ سحر بولا جاتا ہے، جیسے قرآن مقدس کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔ ”فلما القوا سحروا عین الناس واسترھبھوم“ (الاعراف)۔ جب انہوں نے (رسیاں، لاٹھیاں) ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو ڈرایا۔ دوسرے مقام پر بھی یہی تاثر اس طرح ملتا ہے ”یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی“ اُن کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آنے لگا کہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخیل ہی ہو، اس سے زائد کچھ نہ ہو، حقیقت بھی بدل سکتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر جادو کا اثر نبی کی ذات پر بھی ہو جائے تو شان نبوت کے منافی نہیں جیسے بھوک، پیاس، نزلہ، زکام یا کوئی بیماری شان نبوت کے منافی نہیں ایسے ہی جادو بھی نہیں، جیسے اس آیہ مبارکہ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آنے لگا کہ سانپ دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ رسیاں تھیں۔ ”و اوجس فی نفسہ خیفہ“ اس آیہ مبارکہ میں موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہونے کا ذکر ہے مگر یہ خوف نبوت کے منافی نہیں۔ حضور ﷺ پر عبید بن عاصم یہود کی بیٹیوں کا جادو کرنا شان نبوت کے منافی نہیں، وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ نبی ہے یا جادوگر، اگر جادوگر ہوگا تو اثر نہیں ہوگا کہ جادوگر پر جادو کا اثر نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے معمولی سا اثر پیدا کر کے ان کے تصور کو غلط کر دیا اور ثابت کر دیا کہ یہ نبی ہیں۔

سحر کا لغوی معنی تو یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو بدل دیا جائے یا یہ کہہ لیا جائے کہ جھوٹ کو سچ کی شکل میں دکھایا جائے۔ اسی آیہ مبارکہ ”الا باذن اللہ“ کے ارشاد سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چاہنے سے ہی سب کچھ ہوتا ہے کہ قادر مطلق تو وہی ذات بابرکات ہے جیسے آگ کے اندر بذات خود جلانے کی طاقت نہیں ورنہ نمرود کی آگ ابراہیم علیہ السلام کو جلادیتی، چٹھری کے اندر بذات خود کاٹنے کی طاقت نہیں ورنہ اسماعیل علیہ السلام کی گردن کٹ جاتی، زہر کے اندر بذات خود مارنے کی طاقت نہیں ورنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ زہر کا بھرا ہوا پیالہ پینے سے موت کی آغوش میں چلے جاتے۔ یہ سارے اسباب ہیں، مسبب حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس لمبی آیہ کریمہ کی تفسیر میں بہت سے مفسرین کرام نے ہاروت و ماروت کے گناہ میں مبتلا ہونے اور زہرہ نامی خاتون کے شوہر کے قتل ہونے، پھر زہرہ کے آسمان پر چلے جانے کا قصہ لکھا ہے مگر اُسے نظر انداز کرتا ہوں کہ ہاروت و ماروت کا زہرہ کے عشق میں مبتلا ہو کر گناہ کا ارتکاب کرنا فرشتوں کی عصمت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ قرآن مقدس فرشتوں کے بارہ میں فرماتا ہے ”لَا يَعْصُونَ مَا أَمَرَهُمُ اللَّهُ“ فرشتے اللہ کے حکموں کی نافرمانی نہیں کرتے۔ امام فخر الدین رازی، علامہ اسماعیل حقی علیہم الرحمہ ایسے بہت سے محقق مفسرین نے بھی اس واقعہ کو مسترد کیا ہے۔ علامہ اسماعیل علیہ الرحمہ نے تو افسوس سے کہا کہ کاش ایسی روایات سے اہل اسلام کی تصنیفات پاک ہوتیں۔ امام قرطبی نے بھی ان روایات کو ضعیف کہا ہے، ہاروت، ماروت کے اس واقعہ کو کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے اور اُن سے متقدمین کی ایک جماعت نے بطور حدیث بنی اسرائیل نقل کیا ہے جسے اس وقت تک کتب سے نکالا نہ جاسکا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اے ایمان والو! (حضور ﷺ سے بات کرتے وقت)
”راعنا“ نہ کہو بلکہ کہو ”أُنظَرْنَا“ (اور ان کی
بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو اور کافروں کیلئے
دردناک عذاب ہے۔ ﴿۹۹﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا
أُنْظَرْنَا وَاسْمِعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ

تفسیر

﴿۹۹﴾ گزشتہ آیات میں یہود کے ایک برے عقیدہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کو جادوگر سمجھتے تھے ان کی نبوت کے قائل نہ تھے، اس آیہ مبارکہ میں حضور ﷺ کے متعلق اُن کے برے نظریات کا ذکر ہے، حضور ﷺ کی بارگاہ میں صحابہ کرام حاضر ہوتے، آپ کے ارشادات سنتے، اگر کوئی ارشاد اچھی طرح سمجھ نہ آتا تو آپ سے عرض کرتے ”راعنا“ کہ حضور یہ ارشاد اچھی طرح سمجھ نہیں آیا ہماری رعایت

فرمائیں اور دوبارہ سمجھا دیں، یہ درخواست اچھی تھی کہ کلام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں مگر یہی لفظ ”راعنا“ یہودی زبان میں ایسے معنی میں مستعمل تھا جس میں گستاخی کا پہلو نکلتا تھا وہ لوگ اسی لفظ ”راعنا“ کو ”راعینا“ کہہ کر گستاخی کرتے۔ اس کا معنی بدل جاتا ”ہمارا چرواہا“ (معاذ اللہ) یا اس کا معنی رعونت سے لیتے تھے ”کم عقل“ (معاذ اللہ) یا راعن کہتے، جس کا معنی ہے ”خطا“۔ اور حضور کو خطا کرنے والا کہتے (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے اپنے محبوب پاک علیہ السلام کی عزت و عظمت کا اس انداز میں پاس کیا کہ صحابہ کرام کو وہ لفظ کہنے سے ہی روک دیا جسے بگاڑ کر توہین کرتے تھے اور حکم دیا گیا کہ راعنا کی بجائے ”انظرونا“ کہہ لیا کرو۔ سبحان اللہ کس قدر مقام ہے شان نبوت کا، حضور کے بارہ میں ایسا لفظ ہی نہ بولو جس سے بے ادبی کا احتمال ہو ”واسمعوا“ فرما کر بتایا جا رہا ہے کہ میرے محبوب کے کلام کو ہمہ تن متوجہ ہو کر غور سے سنا کرو کہ دوبارہ درخواست کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ یہ آیہ مبارکہ بارگاہ رسالت کے آداب سکھارہی ہے یہ بھی پتہ چل رہا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی تعظیم عبادت و ایمان کی جان ہے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں کہے گئے کلمات میں توہین کا شائبہ بھی پایا جائے تو کفر ہے۔

۔ ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

شاعر کی روح سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ میرے خیال میں اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو اس طرح پڑھا جائے ”نفس گم کردہ می آید مسیحا و کلیم ایں جا“ کہ حضور ﷺ کی بارگاہ وہ بارگاہ ہے جہاں پر عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام بھی دم بخود ہیں۔ جنید و بایزید تو اولیاء اللہ ہیں حضور کی بارگاہ میں تو انبیاء بھی دم بخود ہیں۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہودی لغت کا علم تھا، انہوں نے جب یہود سے یہ کلمات سنے تو فرمایا تم پر خدا کی لعنت، اگر میں نے آئندہ تم سے ایسے لفظ سن لئے تو گردن اڑا دوں گا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ میں جذبہ عشق و محبت اس قدر تھا کہ گستاخ رسول کا

وجود انہیں قطعی گوارا نہ تھا۔ یہ بھی یاد رہے کہ حضور ﷺ کی توہین بالاتفاق کفر ہے، یہ توہین واضح طور پر ہوا اشارہ، کنایہ کے طور پر۔ آپ کی ذات کے متعلق ہوا آپ کی کسی صفت کے متعلق۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

کافروں میں سے اہل کتاب اور مشرکین یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی خیر (وحی) نازل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ جو آیہ ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں کیا (اے مخاطب!) تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کیلئے آسمانوں اور زمینوں کی حکمرانی ہے اور اللہ کے سوانہ کوئی تمہارا حمایتی ہے نہ مددگار۔ ﴿۱۰۰﴾

مَا يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُسْرِكِينَ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرِ قُرْآنٍ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ مَا تَسْخَرُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْشِئُهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

تفسیر

﴿۱۰۰﴾ حضور سید عالم ﷺ کے بارہ میں یہود تین حصوں میں تقسیم تھے، پہلا گروہ سخت دشمن، دوسرا گروہ خاموش، تیسرا گروہ منافق یہود۔ یہ تیسرا گروہ گاہے بگاہے تورات کی بشارات کا ذکر کر کے مسلمانوں کو اپنا بنانا چاہتا اور ان کے دلوں کو اپنی طرف کرنے کیلئے چکنی چڑی باتیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آئیہ مبارکہ میں مسلمانوں کو بروقت متنبہ کیا ہے کہ ان لوگوں کے مکرو فریب میں نہ آجانا، کفار اہل کتاب ہوں

یا مشرک ہوں یہ کبھی چاہتے ہی نہیں کہ تم پر اللہ کا فضل ہو۔ یہود تو یہی کہتے رہیں گے آخرت میں ساری نعمتیں انہیں کے لئے ہیں اور مشرکین بھی کہتے رہیں گے جیسے دنیا کی نعمتیں ان کیلئے ہیں آخرت کی بھی انہیں کیلئے ہوں گی، مگر وہ یہ بات بھول گئے کہ اللہ جسے چاہتا ہے اسے فضل و کرم سے نواز دیتا ہے اور وہی بڑے فضل والا ہے، اس کی ذات پر کسی کو گرفت نہیں کہ ایسا کرے اور ایسا نہ کرے۔ اس آیہ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ انعامات الہیہ کا تعلق اس کے فضل سے ہے جسے چاہے نواز دے۔

اس آیہ کریمہ سے یہ بات بھی مترشح ہو رہی ہے کہ یہود و مشرکین حضور ﷺ کے ساتھ بغض، حسد و عناد کے سبب دشمن ہو گئے اور یہ بیماریاں نہایت تباہ کن ہیں جن سے ہر فرد کو بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہود کو یہ رنج تھا کہ سالہا سال سے نبوت بنی اسرائیل میں رہی اب بنی اسماعیل میں کیوں آگئی، مشرکین کو یہ دکھ تھا کہ مکہ مکرمہ میں بڑے بڑے مشرکین سر کردہ تھے یہ اعزاز انہیں کیوں نہ ملا۔ بنو ہاشم کے یتیم بچے کے ساتھ کیوں وابستہ ہوا۔ یہ حسد تھا جو ان کی تباہی کا سبب بنا۔

آیہ نمبر ۱۰۶ میں یہود کی دشمنی کی ایک وجہ اور بتائی گئی ہے یہ لوگ مسلمانوں سے کہتے تھے، حیرت ہے تمہارے دین میں ایک حکم آج آتا ہے کل کو وہ بدل جاتا ہے، اس کی جگہ دوسرا حکم ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اس دین کے اندر کوئی ٹھوس نظام نہیں، یا (حضور ﷺ نے) اپنی غلطی سے آج کچھ کہہ دیا وہ صبح نہ رہا تو دوسرے دن دوسرا حکم جاری کر دیا۔ اس آیہ مبارکہ میں تردید کی جارہی ہے کہ جب ہم کوئی آیہ منسوخ کر دیں یا ذہنوں سے فراموش کر دیں تو اس سے بہتر یا اُس جیسی لے آئیں گے، کیا تمہیں خبر نہیں اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہود کے احکامات ختم ہوئے اور عیسیٰ علیہ السلام کے احکامات جاری ہو گئے، جو پہلے احکام سے نرم تھے پھر اس کے بعد دین اسلام آیا جو اس سے بھی زیادہ حسین اور جامع ہے۔

کیا تم نے خدا کی قدرت کو محدود سمجھ رکھا ہے کہ وہ ایک حکم کے بعد دوسرا حکم نازل ہی نہیں کر سکتا بلکہ وہ یکے بعد دیگرے اپنے احکام کو بھیج کر انسانیت کی اصلاح کے راستے عطا کرتا ہے، وہی زمین و آسمان کا مالک ہے اس کے علاوہ کوئی تمہارا مددگار نہیں۔ نسخ کے متعلق مزید معلومات کیلئے مقدمہ کا مطالعہ کریں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

أَمْ تَرْيَدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا
سُئِلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَتَّبِعِ
الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝
وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ
إِيمَانِكُمْ كِفَارًا إِحْسَادًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ
مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا
وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ إِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

کیا تم (بھی) چاہتے ہو اپنے رسول سے ایسے
سوال کرو جیسے اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام)
سے سوال کئے گئے تھے اور جس نے ایمان کو کفر
سے بدلا وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا، ﴿۱۰۱﴾
بہت سے اہل کتاب نے حق واضح ہو جانے کے
باوجود حسد کی وجہ سے چاہا کاش وہ ایمان کے
بعد کفر میں لوٹا دیں، سو تم انہیں معاف کرو اور
درگزر کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔ بے
شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ﴿۱۰۲﴾

تفسیر

﴿۱۰۱﴾ آیہ مبارکہ نمبر ۱۰۸ کے بارہ میں مفسرین نے نقل کیا ہے، یہود مسلمانوں کو اُکساتے
رہتے تھے کہ حضور ﷺ سے سوالات کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسا کرنے سے روک دیا کہ تم بھی
یہود کی طرح بے معنی سوالات کرنے کی جسارت کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسا
کرنے سے سختی سے روک دیا اور فرمایا میرے محبوب پاک ﷺ سے بحث مباحثہ، بے مقصد سوالات سے باز
رہو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے، پس یہ ضابطہ سامنے رکھو ”وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ
فَانْتَهُوا“ جو کچھ تمہیں رسول اللہ (ﷺ) دیں اُسے لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ، یہ
بھی بارگاہ رسالت کے آداب میں سے ایک اور ادب سکھایا گیا ہے۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اس آیت کے
مخاطب یہود ہیں ان سے کہا جا رہا ہے کیا تم بھی اپنے وقت کے رسول برحق حضرت محمد ﷺ سے ایسے ہی

سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے تمہارے باپ دادا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئے تھے کہ ہمیں خدا دکھا دے، صفا کو سونا بنا دے، دریا چلا دے وغیرہ، لایعنی سوالات۔ کئی تفاسیر نے یہ معنی کیا ہے۔

﴿۱۰۲﴾ آیہ مبارکہ نمبر ۱۰۹ میں یہود کی ایک دوسری شرارت کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ محض ہٹ دھرمی اور حسد، ضد کی بنا پر چاہتے ہیں کہ جیسے وہ دولتِ ایمان سے محروم ہیں کوئی اور بھی ایمان نہ لائے اور ہر لمحہ مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کیلئے نئے نئے بہانے، منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو فرمایا گیا ہے، ان کی ریشہ دوانیوں کی پرواہ نہ کرو، ان کی زیادتیوں پر درگزر کرو، ان سے الجھاؤ کی ضرورت نہیں جب وقت آئے گا تو ان سے نمٹ لیا جائے گا اور یہ برباد ہو جائیں گے۔ اس آیہ میں تخل، بردباری۔ حوصلہ کا درس دیا جا رہا ہے جو بہت بڑی طاقت ہے۔ مسلمان ان کی سازشوں سے پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ جہاد کا حکم آنے پر کفار و مشرکین سے درگزر کا مسئلہ ختم ہو گیا، اب یا تو ایمان لائیں یا میدان میں آجائیں۔

اس آیہ میں اُن کے حسد کی بھی مذمت بیان کی گئی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑیوں کو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کسی بندے کے دل میں احسان اور حسد جمع نہیں ہوتے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا ”جب تک لوگ حسد نہیں کریں گے خیریت سے رہیں گے“ حسد کی بیماری سے بچنے کیلئے قرآن مقدس کی آخری دونوں سورتوں کی کثرت سے تلاوت اس بیماری سے نجات دیدے گی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُوا
لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ
إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَقَالُوا لَنْ
يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِيًّا
تِلْكَ آيَاتُهَا أَنَّهُمْ قُلُوبُهُمْ لَا يَفْقَهُوا
صَدَقِينَ ۝ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور جو نیک کام تم اپنے لئے
آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں پالو گے بے شک اللہ
(تعالیٰ) تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے ﴿۱۰۳﴾
اور یہود نے کہا جنت میں صرف یہودی جائیں گے یا
عیسائی۔ یہ ان کی (باطل) تمنائیں ہیں آپ کہہ دیجئے
اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ ﴿۱۰۴﴾، ہاں جس نے اللہ
کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکی کرنے والا بھی ہے
تو اُس کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے اور (قیامت
کے دن) ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین
ہوں گے۔ ﴿۱۰۵﴾

تفسیر

﴿۱۰۳﴾ آیت نمبر ۱۱۰ میں مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم یہود کے بہکانے اور اُن کے فتن و
فسادات کی پرواہ کئے بغیر نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ کے دینے پر متوجہ رہو۔ فی الحال اُن سے بدلہ لینے کی
کوشش نہ کرو، ایمان پر ثابت قدم رہ کر آخرت کی بہتری کی کوشش کرتے رہو۔ نماز و زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی
جو نیکی کر سکو کرتے رہو۔ اخلاص، اخلاق، حقوق العباد، حقوق اللہ کی ادائیگی ایسے معاملات پر توجہ دیتے رہو۔
تمہارا کوئی کام ضائع نہیں جائے گا۔ جو کچھ عمل صالح آگے بھیجو گے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے تمہیں مل جائے
گا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ اس ارشاد گرامی کا تعلق بھی ”فاعفوا و اصفحوا“ سے ہے، درگزر
کرتے رہو۔ خاموشی سے نماز، زکوٰۃ اور اعمال صالحہ میں دلچسپی لیتے رہو۔ اس ساری خاموشی کا درس جہاد کا حکم
نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ جب جہاد کا حکم ہو گیا تو اب قبولِ اسلام ہے یا ذمی بن کر رہنا ہے۔

﴿۱۰۴﴾ آیہ نمبر ۱۱۱ میں یہود و نصاریٰ کے ایک بے بنیاد دعویٰ کا ذکر ہے۔ ایک موقع پر نجران کے عیسائی اور مدینہ منورہ کے یہود حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مناظرہ کرنے لگے۔ یہود نے کہا ”جنت میں صرف یہودی جائیں گے“، عیسائیوں نے کہا ”جنت کے حقدار صرف عیسائی ہیں“۔ تو اس آیہ مبارکہ میں ان بے بنیاد عقیدوں کا ذکر ہے۔ حضور ﷺ کو فرمایا جا رہا ہے یا مسلمانوں کو خطاب ہے کہ انہیں کہو اگر تم دونوں اپنے عقیدوں میں سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ یہود نے اپنے جنتی ہونے کا دعویٰ اس بنیاد پر کیا کہ وہ پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ عیسائیوں نے اس بنا پر کہا کہ ان کی جگہ عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھ کر جان دے گئے۔ اور ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔

﴿۱۰۵﴾ آیہ نمبر ۱۱۲ میں فرمایا گیا جنت کا حقدار صرف وہی ہے جس نے اپنا سر اللہ جل جلالہ کے حضور جھکا دیا اور وہ نیک کام بھی کرتا رہا اس شخص کو اس کا اجر اس کے رب کے ہاں ضرور ملے گا۔ انہیں لوگوں کو قیامت کے دن خوف ہو گا نہ غم۔ اسلامی قواعد و ضوابط پر عمل ہی جنت میں لے جاسکے گا۔ اس فقیر نے اپنی کتاب جلوۂ جاناں کے تیسرے حصہ میں اسلام کی ضرورت پر 18 سے زائد دلائل پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ اس نظام کے بغیر انسانیت کا گزارہ ہی نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ بھی اپنے محبوب کے ذریعہ سے عطا فرمادیا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد و علیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

یہود نے کہا نصاریٰ کا کوئی دین نہیں (بے دین ہیں)
اور نصاریٰ نے کہا یہود کا کوئی دین نہیں (بے دین ہیں)
(حالانکہ وہ کتاب (بھی) پڑھتے ہیں اسی طرح بے
علم لوگ (مشرکین) ان کی طرح باتیں کرتے ہیں
اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس چیز میں فیصلہ فرمائے گا
جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ ﴿۱۰۶﴾

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۚ

تفسیر

﴿۱۰۶﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نجران کے عیسائی حضور ﷺ کے ہاں آئے تو یہود بھی انہیں دیکھنے آ گئے اور حضور ﷺ کے سامنے جھگڑنا شروع کر دیا۔ رافع یہودی نے کہا تمہارا دین کچھ نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا۔ نجران کے عیسائیوں میں سے ایک نے جواباً کہا تمہارا دین کوئی دین نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کا انکار کر دیا۔ تو یہ آ یہ کریمہ نازل ہوئی، اس آ یہ مبارکہ میں جن بے علم لوگوں کا ذکر ہے، عطا کہتے ہیں یہ تورات و انجیل کے نزول سے پہلے کے لوگ ہیں بعض نے کہا اس سے مراد مشرکین عرب ہیں۔ چونکہ یہ اہل کتاب نہیں اس لئے انہیں جاہل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے اختلاف میں فیصلہ فرما دے گا اور حق و باطل کا امتیاز ہوگا۔ اس آ یہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مدتوں کی غلطی کا ذکر فرمایا ہے کہ دونوں گروہ تعصب و ہٹ دھرمی کے مرتکب ہو گئے۔ جب توراۃ میں عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کا ذکر ہے اور انجیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے تو تنازع کا ہے۔ یہود نے عیسائیوں پر اس طرح طنز کیا کہ انہوں نے ایک خدا کے تین حصے کر کے اُسے باپ، بیٹا، روح القدس سے موسوم کیا یہ کیسا دین ہے؟ عیسائیوں نے یہود پر طعن کیا کہ تورات میں سوائے دس احکام کے ہے ہی کیا؟ پولوس کہتا ہے توراۃ ظلمت کا پردہ ہے اور موسیٰ (علیہ السلام) تو جلا دوں کے استاذ تھے۔ (بحوالہ حقانی)

اس آ یہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حوصلہ دیا ہے کہ تم انکی مخالفت سے گھبرانہ جانا یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف بہتان، الزام اور لغویات کہہ رہے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد و علی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا
أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا
الْخَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ
وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کا نام ذکر کرنے سے روکے اور اس کو برباد کرنے کی کوشش کرے، انہیں مناسب نہیں تھا کہ مسجدوں میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ڈرتے، ان کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔ ﴿۱۰۷﴾

تفسیر

﴿۱۰۷﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں یہود و نصاریٰ کے ایک دوسرے کو بے دین کہنے کا ذکر تھا، اس آیہ مبارکہ میں ان کے مزید مظالم کا ذکر کیا جا رہا ہے، امام ابن جریر نے مجاہد کے ذریعہ سے یہ بیان کیا ہے کہ عیسائیوں کی قبیح حرکات میں ایک بری حرکت یہ بھی تھی کہ بیت المقدس کی بے حرمتی کرتے تھے اور لوگوں کو وہاں پر نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ان لوگوں سے مراد وہ عیسائی ہیں جنہوں نے محض یہود کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے بخت نصر بابل کی بیت المقدس برباد کرنے میں مدد کی تھی۔

ابن زید فرماتے ہیں ان ظالموں سے مراد وہ قریش مکہ ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیا اور عمرہ کرنے کیلئے مسجد حرام شریف میں داخل نہ ہونے دیا، اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی، روح البیان میں اس آیہ کا شان نزول اس طرح درج ہے۔ عیسائیوں کے ایک بادشاہ طیطوس نامی نے بخت نصر بابل کی مدد کی اور بیت المقدس کی بربادی میں حصہ لیا، یہود کو قتل کیا، تورات کو جلایا، بیت المقدس کو اجاڑ دیا اور بیت المقدس میں مردہ سوڑ پھینکے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک بیت

المقدس اسی حال میں رہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کسریٰ کے بعد یہاں پر اذان و نماز کا اہتمام کرایا۔ اس کے بعد بیت المقدس پر پھر ایک دور گزرا، صدی سے کچھ زائد عرصہ سے انگریز قابض رہے اس کے بعد پھر ایک دور آیا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی علیہ الرحمہ نے ۵۵۵ھ میں فتح کیا اور اس کی رونق بحال ہوئی۔

ان دنوں پھر بیت المقدس شریف عیسائیوں کے قبضہ میں ہے اور ملت اسلامیہ خصوصاً فلسطینی نوجوان اس کی آزادی کیلئے پریشان ہیں اور سردھڑکی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اس آیہ مبارکہ میں ان کا ڈرتے ہوئے مساجد میں داخل ہونے کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو خبر دی جا رہی ہے کہ پریشان نہ ہو جاؤ، وہ وقت جلد ہی آرہا ہے جب مشرکین کو مسجد حرام میں داخلے کی اجازت نہ ہوگی مگر چھپ چھپا کر داخل ہو سکیں گے، چنانچہ ۹ ہجری میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے حکم سے اعلان فرمایا کہ آئندہ کوئی مشرک اس مسجد میں داخل نہ ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ
وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ لَا يَمْلِكُ لِمَنْ شَاءَ اَنْ يَّوْجِبَ لَكَ اَنْ تَعْبُدَہُ ۚ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ
مشرق و مغرب اللہ ہی کیلئے ہیں تم جہاں کہیں بھی
منہ کرو گے وہیں اللہ کی طرف ہی منہ ہوگا بے شک
اللہ بڑی وسعت والا ہے، بہت علم والا ہے۔

﴿۱۰۸﴾

تفسیر

﴿۱۰۸﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں ارشاد تھا کہ مساجد کو ویران کرنے والا بڑا ظالم ہے اس آیہ مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے کسی ظالم کے روکنے سے خدا کا ذکر کر نہیں سکے گا۔ اللہ جل شانہ، تو عظیم سلطنت کا مالک ہے مشرق و مغرب اُسی کے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں سب سے پہلی شی جو قرآن مقدس نے منسوخ کی وہ قبلہ ہے۔ حضور ﷺ جب مدینہ منورہ آئے تو سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز

پڑھتے رہے یہود کو خوشی تھی کہ حضور ﷺ ان کے قبلہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ حضور ﷺ چاہتے تھے کہ قبلہ کعبہ بن جائے چنانچہ یہ حکم نازل ہو گیا کہ ”اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف پھیر لو“ جب حضور ﷺ نے اپنے رخ مبارک کو مسجد حرام کی طرف پھیر لیا تو یہود نے اعتراض کیا کہ انہیں پہلے قبلہ سے کس نے پھیرا۔ تو یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی کہ مشرق و مغرب سبھی خدا کی سمتیں ہیں جدھر بھی منہ کرو گے وہ اللہ ہی کی طرف ہوگا۔

تحویل قبلہ حضور ﷺ کے قلبی تقاضا پر ہوئی ام المومنین سیدہ عائشہ فرماتی ہیں ”ما اری ربک الا یسارع فی ہواک“ حضور! میں آپ کے رب کو اس طرح دیکھتی ہوں کہ وہ آپ کی خواہشات کی تکمیل میں جلدی فرماتا ہے، اس آیہ مبارکہ کے نزول کے سلسلہ میں حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت اس طرح بھی ملتی ہے آپ فرماتے ہیں ایک مرتبہ شدید اندھیرے میں میں نے نماز پڑھی صبح کو معلوم ہوا کہ سمت قبلہ صحیح نہیں تھی تو حضور ﷺ سے عرض کی گئی حضور نماز غیر قبلہ کی طرف پڑھی گئی ہے کیا حکم ہے؟ تو یہ آیہ اتری، مشرق و مغرب سب اُسی کے ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے وہ اس سے پاک ہے بلکہ تمام آسمان زمینیں اس کی ملکیت ہیں سب اس کے تابع فرمان ہیں وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے (سب سے پہلے بنانے والا) اور جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے، تو فرماتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتا ہے۔ ﴿۱۰۹﴾

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهِ قَانِتُونَ ﴿۱۰۸﴾
بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰی
اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَاَیْکُوْنُ ﴿۱۰۹﴾

تفسیر

یہود و نصاریٰ کے غلط عقائد کا ذکر فرمایا جا رہا ہے یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا

﴿۱۰۹﴾

کا بیٹا کہا، عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا، مشرکوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا (معاذ اللہ) رب قدوس نے اس ارشاد گرامی سے ان کے برے عقائد و نظریات کا رد فرمایا ہے انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ تو ”سبحانہ“ فرما کر اس عقیدہ کی تردید کر دی کہ وہ اولاد سے پاک ہے۔ اولاد باپ کی مثل ہوتی ہے اور اللہ بے مثل ہے، عزیر و عیسیٰ علیہما السلام اولاد ہوتے تو وہ بھی اللہ کی طرح واجب و قدیم ہوتے جبکہ ایسا قطعاً نہیں۔

زمینوں اور آسمانوں کی ملکیت فرما کر ان کے باطل عقائد کا رد فرمایا ہے۔ زمین و آسمانوں کو پیدا کر کے اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر فرمایا ہے کہ ان چیزوں کا تو پہلے نام و نشان ہی نہ تھا اُس نے بنایا، نہ نمونہ تھا نہ مادہ تھا اور نہ بنانے کے آلات تھے۔ اس نے زمین و آسمان کو اپنے ارادے سے پیدا فرمایا اس کی قدرت ہے جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو ”کن“ فرماتا ہے اور وہ کام ہو جاتا ہے اسکی ذات گرامی تو لفظ ”کن“ کی بھی محتاج نہیں۔ جب لفظ کن کہنے کا ارادہ ہی فرماتا ہے تو شے ہو جاتی ہے جیسے اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے ”اذا اراد شیان یقول له کن فیکون“ کن فیکون کا یہ معنی بھی ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے جب چاہے پیدا فرمادیتا ہے وہ وقت کا محتاج نہیں مادہ کا محتاج نہیں جیسے چاہتا ہے جتنے عرصہ میں چاہتا ہے پیدا فرمادیتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور ان پڑھ لوگوں (مشرکوں) نے کہا اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے (بھی) اسی طرح ان کے قول کی مثل کہا تھا انکے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے یقین کرنے والے لوگوں کیلئے ہم نے کھلی نشانیاں بیان کر دی ہیں۔ ﴿۱۱۰﴾

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ
أَوْ تَأْتِينَا آيَةً كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ
قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۱۰﴾

تفسیر

﴿۱۱۰﴾ مشرکین نے کہا اللہ ہمارے ساتھ بات کر کے حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے کے بارے میں کیوں نہیں کہتا کہ ہمیں اطمینان ہو جائے وہ نبی ہے اور بے دھڑک اس پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس کوئی ایسی کھلی نشانی آجائے جو انکی نبوت پر ہمیں قائل کر لے۔ جواب فرمایا جاتا ہے کہ ان کا ایسا کرنا یا کہنا پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا ہے اس سے پہلے بھی یہود و نصاریٰ نے یہی کچھ کہا تھا۔ ان کا ایسی باتیں کرنا تلاش حق کیلئے نہیں بلکہ محض ضد ہے، ہٹ دھرمی ہے۔ ان کے اور ان سے پہلے کفار کے اس سلسلہ میں دل ایک ساتھ ہو گئے ورنہ ایمان لانے والوں کیلئے تو ہم نے واضح اور کھلے دلائل بیان کر دیئے ہیں۔ ان کی طرح پہلے یہود نے بھی موسیٰ علیہ السلام سے بے معنی مطالبات کیے تھے۔ مثلاً کہا ہمیں خدا دکھا دے، اور لوگوں کی طرح ہمارا بھی خدا بنادے، جنگل تیبہ میں ایک کھانے پر صبر نہ کرنا وغیرہ ان کے جواب میں فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے اپنے آخری رسول ﷺ کے متعلق تو ہزاروں واضح نشانات و دلائل دے دیئے ہیں مگر یہ دلائل فائدہ انہیں دیں گے جو حق و انصاف کے متلاشی ہوں گے۔

کیا میرے محبوب (ﷺ) کی صداقت کیلئے ایک ہی نشانی کافی نہیں؟ وہ قرآن مقدس کا نزول ہے۔ جس کا ایک ایک حرف حضور ﷺ کا معجزہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے ان کے بڑے بڑے گم سُم رہ گئے اور مقابلہ میں ایک ایک آئیہ بھی نہ لاسکے۔ اس آئیہ کریمہ میں حضور ﷺ سے فرمایا جارہا ہے۔ محبوب! کفار کے حاسدانہ کردار اور متکبرانہ روش سے پریشان نہ ہوں کہ آپ کے ہزاروں معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے ان کا یہ انداز پہلا نہیں ان سے پہلے لوگ بھی پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ ان کے دل ضد، ہٹ دھرمی میں ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ مشرکین مکہ نے حضور ﷺ سے کچھ اس قسم کے بے معنی سوالات کیے تھے جو سورۃ بنی اسرائیل میں درج ہیں۔ ہمارے سامنے پانی کے چشمے بہہ جائیں، کھجوروں، انگوروں کے باغ ہو جائیں، پھر نہریں جاری ہو جائیں، ہم پر آسمان گر جائے، فرشتے سامنے

آئیں خدا ظاہر ہوا ایک مرتبہ ہی کتاب آجائے وغیرہ ان کے یہ مطالبات ایسے نہ تھے جو ہو نہیں سکتے تھے اگر ان کے اشارے سے چاند ٹوٹ سکتا ہے سورج لوٹ سکتا ہے درخت چل سکتے ہیں پتھر کلمہ پڑھ سکتے ہیں تو یہ مطالبات بھی پورے ہو سکتے تھے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ یہ چیزیں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائیں گے۔ جیسے سورۃ الانفال کے اندر ذکر ہے ”ولو علم اللہ فیہم خیرا لاسمعہم“ اگر اللہ تعالیٰ ان میں خیر جانتا تو انہیں ضرور سنا دیتا ”ولو اسمعہم لتولوا“ اور اگر انہیں سنا دیتا تو وہ اعراض کرتے۔

اگر معجزات دیکھ کر وہ نہ مانتے تو ان پر آسمانی عذاب مسلط ہو جاتا اور ایسا ہونا سنت الہیہ کے خلاف تھا کہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا کہ حضور کے ہوتے ہوئے آسمانی عذاب نہیں آئے گا اور انکے اس عذاب کو قیامت تک ملتوی کر دیا اس آیت مبارکہ میں مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جاہل فرمایا گیا ہے حالانکہ ان میں بہت سے لوگ پڑھے لکھے عالم فاضل بھی تھے، معلوم ہوا جو قطعی اور قوی دلائل کو نہ مانے اور ضد کرے وہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو وہ جاہل ہے، ضدی ہے، ہٹ دھرم ہے اور متعصب ہے۔ یہ صفات عالم کی نہیں جاہل کی ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے
رحمت کی خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے
والا۔ آپ سے جہنمیوں کے بارہ میں نہ پوچھا جائے

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا
تَسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿۱۵﴾

گا۔ ﴿۱۱۱﴾

تفسیر

﴿۱۱۱﴾ ہو سکتا تھا کہ معاندین کے بے معنی سوالات پر حضور ﷺ کے قلب انور پر کوئی بات
گراں گزرتی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے فرمایا کہ محبوب (ﷺ) آپ ہمارے سچے رسول ہیں ہم

نے آپ کو کتاب سے نوازا، سچا دین عطا کیا۔ آپ ماننے والوں کو خوشخبری سناتے رہیں اور نہ ماننے والوں کو سزا سے ڈراتے رہیں آپ سے دوزخیوں کے بارہ میں نہ پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں نے اسلام قبول کیوں نہ کیا اور دوزخ میں کیوں گئے۔ آپ اپنا کام تبلیغ کرنا، لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینا جاری رکھیں اور ان کے عناد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی پرواہ نہ کریں۔

اسی آیہ کریمہ کے تحت ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کاش مجھے اپنے والدین کے بارہ میں پتہ ہوتا کہ ان کا کیا حال ہے، تو یہ آیت اتری۔ اس روایت کے متعلق علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے، یہ معضل الاسناد ہے، ضعیف ہے اور حجت نہیں۔ شیخ سیوطی کے اس ارشاد کے بعد مزید دلائل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اور یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے حتیٰ کہ آپ انکی ملت کی پیروی کریں آپ کہہ دیجئے اللہ کی (دی ہوئی) ہدایت ہی (اصل) ہدایت ہے (اے مخاطب) جب تیرے پاس علم آچکا اس کے بعد بھی تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تجھے اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے کوئی دوست ہو گا نہ کوئی مددگار۔ ﴿۱۱۲﴾

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَهُمْ ۖ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۚ وَلَئِنَّ آتِیَاتَهُمْ مِنْ بَعْدِ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ

تفسیر

﴿۱۱۲﴾ یہود و نصاریٰ کی ضد اور ہٹ دھرمی کی مذمت کی جا رہی ہے کہ دین اسلام کی حقانیت و صداقت اور حضور ﷺ کی نبوت کی صداقت کے ہزاروں دلائل انہوں نے دیکھ لئے مگر پھر بھی وہ چاہتے ہیں

کہ آپ ان کے دین میں آجائیں۔ اور ان کا دین ہے کیا؟ محض ضد، محض تعصب جس پر اڑ چکے ہیں وہ صرف اس بات پر خوش ہوں گے کہ آپ انکی اتباع کریں، جو محال ہے ورنہ کبھی خوش نہیں ہوں گے یہ لوگ ازلی بد نصیب ہیں محروم قسمت ہیں ان کے لیے ہدایت کہاں؟ انہیں کہہ دیجیے ہدایت تو وہ ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے آپکی ہے۔ نبی ہونا تو اپنی ذات میں ایک بہت بڑا منصب ہے اور وہ تو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہے وہ گمراہ قوموں کو حق کی طرف بلاتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری اتباع کرے (اے مسلمان) تو بھی محتاط رہنا اگر تو نے حق و صداقت ظاہر ہو جانے کے بعد انکی پیروی کی تو رحمتِ خداوندی سے محروم ہو جائے گا اس آیت مقدسہ سے پتہ چلتا ہے کہ کافر مسلمان سے کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتا مسلمان حکمرانوں کا یہ سمجھ لینا کہ کافر ان سے خوش ہے تو ملک خوش حال ہے، یہ ایک گھٹیا سوچ ہے۔

حضور ﷺ کا انہیں فرمانا کہ ہدایت تو صرف اللہ کی ہی ہدایت ہے (جو میرے ساتھ ہے) اس ارشاد سے نمایاں ہے حضور ﷺ کا ان کی اتباع کرنا محال ہے جو کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی انکار کرتا ہے وہی نقصان اٹھانے والا ہے۔ ﴿۱۱۳﴾

الَّذِينَ اتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۱۳﴾

تفسیر

﴿۱۱۳﴾ یہود و نصاریٰ کی ضد اور ہٹ دھرمی کے ذکر کے بعد مسلمانوں کی اچھائی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا ٹھیک حق ادا کرتے ہیں اس میں لوگوں کو تلاوت کرنے کی طرف

مائل کیا جا رہا ہے اور اس کام کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، یہ صفت صرف قرآن مقدس کی ہی ہے،
توراة، انجیل کی نہیں کہ اب ان کی تلاوت جائز ہی نہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تورات کی تلاوت پر حضور ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور
فرمایا اگر موسیٰ علیہ السلام ہوتے تو انہیں میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ قرآن مقدس کی تلاوت کرنا
ایک عظیم نعمت کا حاصل کرنا ہے۔ اس عمل سے خدا کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ تلاوت کے وقت دل حاضر ہو،
آنکھوں سے آنسو جاری ہوں تو زہے قسمت۔ دوسرا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس آیہ سے اہل کتاب کے
بعض دیانتدار لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ توراة سے دلی لگاؤ اور اس پر ایمان رکھتے ہیں جیسے عبد اللہ بن
سلام اور اُن کے دوسرے چند ساتھی۔ یہ معنی قرآن مقدس کی حقانیت کو بھی واضح کر رہا ہے کہ اُس نے
معاندین یہود کے ذکر کے بعد توراة سے اخلاص والوں کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

اے بنی اسرائیل میری اُن نعمتوں کو یاد کرو جو میں
نے تم پر انعام کی ہیں اور بے شک میں نے تمہیں
(تمہارے زمانہ میں) تمام جہانوں پر فضیلت دی
اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کی
طرف سے بدلہ نہ دے سکے گا اور نہ ہی کسی شخص
سے فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کسی شخص کو (بلا
اذن) کسی کی شفاعت نفع دے گی اور نہ ہی ان کی
مدد کی جائے گی۔ ﴿۱۱۳﴾

يَذَرْنِي إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي اَنْعَمْتُ
عَلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ اَنْتُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۱۳﴾
وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا
وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۱۱۴﴾

تفسیر

﴿۱۱۴﴾ کچھلی آیہ مبارکہ میں یہود و نصاریٰ کی ہٹ دھرمی کا ذکر تھا کہ وہ حضور ﷺ سے اپنے تعلقات صرف اس صورت میں بہتر رکھ سکتے ہیں کہ حضور (ﷺ) ان کی اتباع کریں، اب اس آیہ کریمہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کے کرم کا ذکر ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل تم تو ضدی ہو، ہٹ دھرم ہو مگر ہمارا کرم دیکھو کہ ہم نے تمہیں پھر بھی اپنے عظیم کرم سے نوازا ہے تم میرے انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے ہیں۔ میں نے تمہیں اُس زمانہ کے سب لوگوں پر فضیلت دی، بنی اسرائیل پر ان نعمتوں سے مراد عام نعمتیں بھی ہیں جو زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور خاص نعمتیں بھی۔ ان خاص نعمتوں میں ان کے اندر انبیاء علیہم السلام کا بھیجنا، ان کا انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہونا، تورات سے نوازا جانا، من و سلویٰ کا اترنا، فرعونوں سے نجات دینا، دریا کا پھٹنا وغیرہ۔ بنی اسرائیل تمہیں تو چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر کرتے مگر تم بجائے شکر کے گستاخیاں کرنے لگ گئے یہ بات ذہن سے نکال دو کہ تم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہونے کی بنا پر قیامت کو پوچھے ہی نہیں جاؤ گے۔ اُس دن سے ڈرو جس دن کافر کو کسی کی سفارش نفع نہ دے گی اور نہ اس کی مدد کی جائے گی۔ کسی غلط فہمی میں نہ رہ جانا۔ دنیا میں سزا سے بچنے کیلئے جتنے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ قیامت کے دن اُن میں سے کوئی طریقہ بھی کام نہیں دے گا۔ بے شک یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونا تمہارا شرف ہے مگر یہ شرف بھی اسی وقت کام دے گا جب اسلام سے وابستگی ہوگی اور حضور ﷺ کی اطاعت ہوگی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ
 قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۚ قَالَ وَمِنْ
 ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝

اور جب کئی باتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے آزمایا تو انہوں نے ان سب کو پورا کر دیا، اللہ (تعالیٰ) نے فرمایا بے شک میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا اور میری اولاد سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ ﴿۱۱۵﴾

تفسیر

﴿۱۱۵﴾ پچھلی آیہ مبارکہ میں یہود و نصاریٰ کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اور عمل صالح کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر کر کے انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی کے تو تم بھی قائل ہو۔ ان کی ذات والا صفات کو دیکھو کہ وہ کس قدر مشکلات سے گزرے اور رب قدوس کے فرمانبردار رہے اور اللہ تعالیٰ کے تمام ارشادات کو پورا پورا نبھایا اور پھر اس عظیم وفاداری پر انہیں لوگوں کا امام بنایا گیا، ابراہیم علیہ السلام کا یہ تفصیلی واقعہ حضور ﷺ کی نبوت و صداقت کی دلیل ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جب اپنے بیٹے کو ذبح کرنے لے گئے تو اس کی جگہ دنبہ کا آنا اور ذبح ہونا، ان کی یہ یاد اسلام نے قائم رکھی ہے، دنیا کے کسی اور دین میں یہ یادگار نہیں ہے، قربانی کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے چاند تاروں کی پرستش سے انکار کیا، اسلام بھی یہی سکھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی عبادت نہیں۔ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی تعمیر کی، وہی تعمیر آج ملت اسلامیہ کا مرکز ہے۔ ان باتوں سے واضح ہوتا ہے، ابراہیم علیہ السلام کے صحیح وارث مسلمان ہی ہیں، یہود و نصاریٰ کا محض دعویٰ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو جن امتحانات سے گزرنا پڑا، ان میں احکام الہیہ کی پابندی، اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کیلئے لے جانا،

نمرود کی آگ سے دوچار ہونا، سیدہ ہاجرہ اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑنا، آپ کے یہ امتحانات کسی جرم کا بدلہ نہیں (معاذ اللہ) بلکہ شان تربیت ہے۔

اور اس مرحلہ سے گزار کر بلند ترین مقامات سے نوازنا ہے۔ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ پورا اسلام تیس (۳۰) حصوں میں ہے۔ دس (۱۰) سورہ برأت میں درج ہیں، دس (۱۰) سورہ احزاب میں اور دس (۱۰) سورہ مومنون میں ہیں۔ ان تمام چیزوں کا پورا حق ادا کیا اور ان سب امتحانات میں کامیاب رہے۔ سورہ برات میں مومنین کی صفات کا ذکر ”التائبون العابدون“ سے شروع ہوتا ہے۔ سورہ مومنون میں دس صفات کا ذکر ”قد افلح المومنون“ سے شروع ہوتا ہے اور سورہ احزاب میں دس صفات کا ذکر ”ان المسلمین والمسلمات“ سے شروع ہوتا ہے۔ ان تمام امتحانات میں نمایاں کامیابی پر جو انعام ملا وہ یہ ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو لوگوں کا امام بنادیا گیا۔ اسی آیہ مبارکہ میں امامت اور پیشوائی کے عظیم منصب کے متعلق بھی فرمادیا گیا ہے کہ یہ منصب ظالموں، فاسقوں کو نہیں مل سکتا، یہ منصب خلافت الہیہ ہے اور خلافت الہیہ کا حقدار کوئی باغی، سرکش، ظالم نہیں ہو سکتا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَاذْجَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا
وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰہِیْمَ مُصَلًّیٰ وَعِہْدَنَا
إِلَیْ إِبْرٰہِیْمَ وَاسْمٰعِیْلَ اَن طَهَّرَا بَیْتِی
لِلطَّٰیِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالزَّکَّیِّ السَّجُّودِ

ترجمہ: اور (یاد کیجئے) جب ہم نے بیت اللہ (کعبہ) کو لوگوں کیلئے عبادت اور امن کی جگہ بنادیا اور مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو اور حکم کیا ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔ ﴿۱۱۶﴾

تفسیر

﴿۱۱۶﴾

بیت اللہ شریف کی مرکزیت اور اہمیت کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ اس کو یاد کرو کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو ”مشابہ“ بنایا، ”مشابہ“ کا معنی عبادت کی جگہ بھی ہے اور لوٹنے کی جگہ بھی کہ اس مقام کی مرکزیت کا یہ عالم ہے کہ جو کوئی ایک مرتبہ حاضری دے لیتا ہے وہ دوبارہ جانے کیلئے بھی بے تاب رہتا ہے۔ اور وہاں کی حاضری بار بار دیتا ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں ”لا یقضى احد منها وطرا“ کوئی آدمی اس کی زیارت سے کبھی سیر نہیں ہوتا، بلکہ ہر مرتبہ شوق بڑھتا ہے۔ بیت اللہ شریف کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ زیارت سے جی نہیں بھرتا، بار بار خواہش ہوتی ہے۔

یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اجر و ثواب کی جگہ کہ جس قدر یہاں پر نیکی کا ثواب ملتا ہے کسی دوسری جگہ نہیں، بیت اللہ شریف کو امن کی جگہ بنایا تو وہاں پر قتل و غارت، لڑائی جھگڑے کو حرام فرمایا۔ مقام ابراہیم پر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے۔ جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر فرماتے تھے۔ وہ پتھر ”گو“ کا کام دیتا تھا اس پتھر کو یہ برکت نصیب ہوئی ہے کہ امت مسلمہ کو حکم دیا جا رہا ہے وہاں پر نماز پڑھیں۔ اس پتھر کی یہ عظمت، یہ برکت قدم ابراہیم علیہ السلام کا صدقہ ہے جس پتھر پر خلیل علیہ السلام نے قدم رکھا وہ مقام نماز کی حیثیت حاصل کر گیا۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ! (ﷺ) کاش ہم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیں تو یہ آیت نازل ہوگئی۔ واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی (مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو)۔ اسی طرح دو اور مقامات پر اللہ تعالیٰ نے میری درخواست کو شرف بخشا اور آیات نازل فرمائیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے بیت اللہ شریف کے طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی اور صفا و مروہ کی سعی کی۔

اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو تاکید دی کہ وہ بیت اللہ شریف کو طواف کرنے

والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے پاک صاف رکھیں اس ارشاد خداوندی سے واضح ہوا کہ مساجد کو پاک، طیب، طاہر رکھا جائے۔ اس آیہ مبارکہ میں طواف کا ذکر پہلے ہے جس سے عبادات میں طواف بیت اللہ شریف کی عظمت ثابت ہو رہی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے درخواست کی اے میرے رب! اس کو امن والا شہر بنا دے اور اس میں بسنے والوں میں سے جو اللہ پر، قیامت پر ایمان لائیں انہیں پھلوں سے رزق عطا فرما۔ فرمایا جس نے کفر کیا میں اس کو بھی کچھ فائدہ دوں گا پھر اُسے مجبور کر کے درزخ میں ڈالوں گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے ﴿۱۱۷﴾۔ اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا کر رہے تھے) اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما بے شک تو بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ﴿۱۱۸﴾

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

تفسیر

﴿۱۱۷﴾ اس آیہ مبارکہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، لفظ رب کے ذکر سے دعا کا سلیقہ دیا گیا ہے کہ یہ لفظ رحمت خداوندی کو متوجہ کرنے کیلئے بہتر و مؤثر ہے۔

☆ پہلی دعایہ ہے ”اے اللہ اس بے آب و گیاہ علاقہ کو شہر بنا دے“ آپ کی یہ دعا ایسی قبول ہوئی ہے کہ مکہ مکرمہ دنیا بھر میں ایک عظیم مرکزی شہر بن گیا ہے۔

☆ دوسری دعایہ عرض کی کہ ”یہ شہر امن والا بھی ہو“ دنیا نے دیکھا کہ کس قدر امن ہے، سکون ہے، کوئی ظالم سے ظالم بادشاہ بھی یہاں تخریب کاری میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کے برے ارادوں کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ تیج اول کی بربادی، ابرہہ کی تباہی کھلے دلائل ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس شہر کی عظمت و تقدس کا شہرہ رہا ہے۔ وہ لوگ بھی بیت اللہ شریف کی تعظیم کو بہت اہمیت دیتے تھے، بیت اللہ شریف کے پُر امن ہونے کے مسئلہ کو قرآن مقدس نے خوب خوب واضح کیا ہے، کسی کافر کو اس مقدس مقام کو پامال کرنے کی قدرت نے ہمت ہی نہیں دی۔ اگر کبھی کوئی چھوٹا، موٹا واقعہ پیش آیا ہے تو وہ نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے ہوا جیسے قرامطہ اور یزیدی دور میں ہوا۔

☆ تیسری دعایہ کی کہ ”اے اللہ اس شہر کے باسیوں کو پھلوں کے رزق سے نواز“ آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ یہ ساری دعائیں کس حد تک شرف قبولیت سے نوازی گئی ہیں۔ اس بے آب و گیاہ علاقہ میں طائف، شہر کا وجود قبولیت دعا کا کھلا ثبوت ہے۔ جو باغات اور پھلوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں (راقم الحروف) نے اس شہر میں ہفتہ سے زائد دن قیام کر کے قبولیت دعا کے مناظر دیکھے ہیں۔ ثمرات سے مراد صرف درختوں کے پھل ہی نہیں بلکہ ہر شے کا ثمرہ ہے۔ ہر چیز سے حاصل ہونے والی شے کو ”ثمرہ“ کہا جاتا ہے۔ مختلف کاروبار کے ثمرات، مختلف کارخانوں کے ثمرات، مختلف اوزار کے ثمرات، مختلف محنتوں کے ثمرات (نتائج) قرآن مقدس کے ارشاد ”یجبئی الیہ ثمرات کل شئی“ نے اس مفہوم کو بہت نمایاں فرما دیا ہے۔

﴿۱۱۸﴾ اس آیت میں پہلی بات فرمائی گئی کہ جب ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام بیت اللہ شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ (بنیادیں اٹھانا اور ہے، کھودنا اور چیز ہے) جن لوگوں کا خیال ہے کہ بیت اللہ شریف ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کے وقت تعمیر ہوا۔ صحیح نہیں بلکہ یہ تو تخلیق آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا

تعمیر ہوا ہے۔ جب زمین کے فرشتوں نے کہا کہ ہمارے لئے بھی عبادت گاہ ہو جیسے آسمانی فرشتوں کیلئے بیت المعمور ہے تو حکم ہوا تم بھی ٹھیک بیت المعمور کے نیچے تعمیر کر لو۔

☆ اسی آیہ مبارکہ میں آپ کی چوتھی دعا یہ ہے ”رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا“ اے ہمارے رب ہماری طرف سے یہ خدمت قبول فرما۔ بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمیں اپنا تابع فرمان بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار رکھ اور ہمیں حج کے مناسک بتا، اور ہماری توبہ قبول فرما بے شک تو ہی توبہ قبول فرمانے والا،

بہت رحم فرمانے والا ہے۔ ﴿۱۱۹﴾

تفسیر

﴿۱۱۹﴾ اس آیہ مبارکہ میں آپ کی پانچویں دعا کا ذکر ہے ”اے اللہ ہمیں اپنا تابع فرمان بنائے رکھنا“ اُلُوہیت کے بعد سب سے بڑا مقام نبوت کا ہے، مگر پھر بھی دونوں باپ بیٹے نے بارگاہ قدس میں اپنے تابع فرمان بنے رہنے کی التجا کی ہے اور پھر ساتھ ہی اپنی اولاد کے تابع فرمان ہونے کی درخواست کر دی۔ یہ دعا ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت اور خوف خداوندی کا منظر ہے کہ بارگاہ قدس میں سراپا عجز و انکساری کے ہوتے ہوئے بھی پھر مزید تابع رہنے کی درخواست کی جا رہی ہے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ کسی کو جس قدر اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے اسی قدر عجز و انکساری بڑھتی جاتی ہے۔

اسی دعا میں اپنی اولاد کو شریک فرمایا، جس سے پتہ چلتا ہے، ماں باپ کے ذمہ اولاد کے سلسلہ

میں صرف یہی کافی نہیں کہ اس کی ظاہری زندگی کی دیکھ بھال کرے بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس کی دینی تربیت کا خیال کرے اور اُسے ربِ قدوس کے تابع فرمان بنانے کیلئے جہاں تک ہو سکے، محنت کرے۔ اس دعا سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، اولاد کی محبت و تربیت بھی دین کا اہم حصہ ہے۔ اس دعا سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بڑے لوگوں کی اولاد بھی ان کی راہ اپنائے تو عوام میں ان کی عظمت و مقبولیت فطری ہوتی ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا بھی عجیب رنگ لائی کہ آپ کی اولاد کفر و شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں اور جاہلیت کے طوفانوں میں توحید خداوندی کی علمبردار رہی۔ جیسے جاہلیت کے دور میں قس بن ساعدہ حضور ﷺ کے جد امجد جناب عبدالمطلب عمر بن نفیل کے تاریخی واقعات شاہد ہیں۔ کہ یہ لوگ کفر و شرک سے بیزار تھے۔

☆ اسی آیہ مبارکہ میں آپ کی چھٹی دعا ”اَرِنَا مَنَاسِكَنَا“ ہے اے اللہ! ہمیں حج کے مناسک (احکام) بھی بتا دے، دکھا دے۔ ”اَرِنَا“ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں مقامات حج، منی، عرفات، مزدلفہ دکھا دے، کسی شے کا دیکھنا دونوں طرح سے ہو سکتا ہے، آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے یا دل سے۔ دونوں معنی میں یہ درست ہیں۔ اپنے لئے اپنی اولاد کیلئے حج کے مناسک کیلئے خصوصاً ذکر کرنے میں اشارہ ملتا ہے کہ اے اللہ میری اولاد کو ایسا تابع فرمان بنا کہ حج کے سلسلہ میں عقلی اعتراضات میں نہ پھنس جائے۔ احکام کا فلسفہ سمجھ آئے یا نہ آئے، بجا ضرور لائے، حج کے بہت سے احکام عقل سے ماوراء محسوس ہوتے ہیں، وہ عقل میں نہیں عشق میں سماتے ہیں۔

دیوانوں جیسا انداز، بکھرے بال، احرام کا پہننا، شیطانوں کو کنکر مارنا، کعبہ کے گرد گھومنا، حجر اسود کا چومنا، یہ سب عشق ہی عشق ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس دعا کے بعد جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور آٹھویں ذی الحجہ سے تیرہویں ذی الحجہ تک سارے اعمال حج کروائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا
عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

اے ہمارے رب اُن ہی میں سے ایک عظیم رسول
بھیج دے جو ان لوگوں پر تیری آیات کی تلاوت
کرے اور انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور ان کے
نفوس کو پاک، صاف کرے بے شک تو ہی غالب
ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ﴿۱۲۰﴾

تفسیر

﴿۱۲۰﴾ اس آیہ مبارکہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ساتویں دعا کا ذکر ہے جو آپ نے مکہ
والوں کے لئے فرمائی۔ وہ ان میں ایک عظیم المرتبت رسول بھیجنے کی دعا ہے۔ اس عظیم الشان رسول کے متعلق
سبھی تفاسیر نے لکھا ہے کہ اس سے مراد حضور سید عالم ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔ خود حضور ﷺ کی زبان
فیض ترجمان سے اس دعا کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں، میں عیسیٰ
علیہ السلام کی بشارت ہوں، میں اپنی ماں کا وہ منظر ہوں جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا کہ
ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محلات نظر آ گئے تھے۔ (اس روایت کو بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے)
آپ کی اس دعا میں یہ بھی بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے رسول کے متعلق درخواست کی ہے وہ
انسانوں میں سے آئے، جن، فرشتہ نہ ہو کہ انسان اس سے فائدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔ نیز یہ بھی واضح ہے
کہ وہ رسول مکہ سے ہو، تا کہ وہ اس کی زندگی کو اچھی طرح سے دیکھ بھال لیں اس کی دیانت، شرافت،
اخلاص کا کوئی پہلو ان سے مخفی نہ ہو۔

جیسے اعلان نبوت کے بعد صفا پر خطبہ میں اہل مکہ سے حضور ﷺ نے فرمایا ”ہل وجدتمونی
صادقا او کاذبا“ مکہ والو! مجھے سچا جانتے ہو یا جھوٹا؟ تو سبھی نے یک زباں کہا ”بل وجدناک
صادقا“ ہم نے تجھے سچا پایا۔ یہ اعتراف حقیقت تھا، یہ اعتراف صداقت تھا۔ آپ کی یہ دعا گزشتہ تمام

دعاؤں سے بڑھ کر ہے اور مرکزی دعا ہے اور پچھلی آیہ کریمہ میں تابع فرمان اولاد کا ذکر تھا۔ اب اس آیہ کریمہ میں اُس اولاد کے مربی و معلم و راہنما کا ذکر ہے۔ آپ کی اس مرکزی دعا میں قرآن مقدس کی تلاوت کی اہمیت، تزکیہ نفس، کتاب کی تعلیم اور درس و تدریس کی عظمت واضح طور پر نمایاں ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اولاد کے جس گروہ کے تابع فرمان ہونے کی درخواست ہے ”وہ امت مسلمہ ہے“ واللہ الحمد۔ اس آیہ مبارکہ میں حضور ﷺ کی متعدد صفات مبارکہ کا ذکر ہے، مکی ہو، یکتا رسول ہو (جیسے رسولاً کی تنوین سے واضح ہے) آیات پڑھ کر سنائے، پڑھنا سکھائے، دانائی کا درس دے، دلوں کو پاک صاف کرے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ قَوْلِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمِّنِ سَفِيهَ
نَفْسِهِ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّا
فِي الْآخِرَةِ لَكَيْنَ الصَّالِحِينَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُ
رَبُّهُ اسْلِمْ قَالَ اسَلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

ملت ابراہیم (علیہ السلام) سے کون لا پرواہی کر سکتا ہے۔ سوا اس کے جس نے اپنے کو بے وقوف بنا لیا ہے۔ اور بے شک ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو دنیا میں چن لیا اور بے شک وہ قیامت میں نیک لوگوں میں ہوں گے۔ اور یاد کرو جب اُس کو اس کے رب نے فرمایا جھک جاؤ تو (ابراہیم علیہ السلام نے) عرض کی میں نے تمام جہانوں کے رب کے سامنے گردن جھکا دی۔ ﴿۱۲۱﴾

تفسیر

﴿۱۲۱﴾ اس آیہ مبارکہ میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ ملت ابراہیم سے روگردانی صرف وہی شخص کرے گا جو بے وقوف ہوگا کہ دلائل کو سن کر حق کو دیکھ کر پھر روگردانی کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے؟

ملت ابراہیمی کی صداقت کیلئے یہ کتنی بڑی دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہود نے کہا کہ وہ یہودی ہیں، عیسائیوں نے کہا وہ عیسائی ہیں۔ یہ سارے گروہ اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام سے وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور جب یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ سیدنا خلیل علیہ السلام نے جس رسول کیلئے دعا مانگی تھی وہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد ﷺ ہی ہیں۔ اور پھر حضور ﷺ نے جو لوگوں کو دعوت دی وہ ملت ابراہیم ہے۔ تو اب اس حقیقت کو سمجھنے میں کیا کمی رہ گئی کہ مسلمان ہی ملت ابراہیمی ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ کے سارے دعوے غلط ثابت ہو گئے۔ اب وہ شخص جو اپنے ابراہیمی ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اور دعاء ابراہیم (حضور ﷺ) کا انکار کرتا ہو وہ احمق نہیں تو کیا ہے۔ اس آیت مبارکہ نے بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے منتخب کردہ ہیں اور آخرت میں صالحین سے ہیں۔

اس منظر کو بھی سامنے رکھو جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا میرے حضور گردن جھکا دو (اطاعت پر قائم رہو) تو آپ نے جھٹ فرمایا کہ تمام جہانوں کے رب پر اسلام لایا۔ اسلام کا معنی ہے ”گردن بہ اطاعت نہاد“ بندگی کیلئے گردن جھکا دینا۔ یہاں گردن کو ہمیشہ جھکائے رکھنے اور توحید پر پکا رہنے کا عہد ہے۔ ورنہ انبیاء علیہم السلام تو پیدائش ہی نبی ہوتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پنگھوڑے میں اعلان فرمایا ”وجعلنی نبیاً“ مجھے اللہ نے نبی بنایا ہے اور مجھے کتاب بھی دی ہے۔ حضور ﷺ تو سید الانبیاء ہیں، انبیاء علیہم السلام کے سارے کمالات اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر جمع فرمائے ہیں۔

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضاداری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَوَضَّيْ بِهَا اِبْرَاهِمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَدَيَّ
 اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰ لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُوْا
 اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ
 اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا
 تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ
 اَبَائِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا
 وَّاحِدًا ۝ وَنَحْنُ لَكَ مُّسْلِمُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ
 خَلَقَ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ
 وَلَا تَسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اسی ملت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور
 یعقوب نے کہا اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے
 تمہارے لئے اس دین کو پسند کیا ہے مرنے تک تم
 اسی دین (اسلام) پر رہنا۔ ﴿۱۲۲﴾ کیا تم اس
 وقت حاضر تھے جب یعقوب کو موت آئی۔ جب
 یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم
 کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا ہم آپ
 کے معبود کی عبادت کریں گے اور آپ کے باپ
 دادا، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق کے معبود کی، ایک
 معبود کی، ہم اُسی کے تابع فرمان ہیں ﴿۱۲۳﴾ وہ
 امت گذر گئی اس نے جو کام کئے اس کیلئے اور تم نے
 جو کام کئے تمہارے لئے۔ اُن کے کاموں کے
 متعلق تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ ﴿۱۲۴﴾

تفسیر

﴿۱۲۲﴾ گزشتہ آیات میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی متعدد دعاؤں کا ذکر تھا جو آپ نے اولاد،
 عقیدتمندوں کیلئے بارگاہ قدس میں عرض کیں۔ آپ کے اس عمل سے آپ کا اولاد سے حسن سلوک، پیار و
 محبت نمایاں ہو رہا ہے۔ اس آیہ پاک میں آپ نے پیروکاروں کو وصیت فرمائی ہے، تاکید دی کہ دیا ہے کہ
 بیٹو! دین اسلام پر ثابت قدم رہنا، جھوٹے دینوں سے بچنا، تمہاری کوشش ہونی چاہئے کہ جب تم دنیا سے
 رخصت ہو تو بارگاہ قدس میں تمہاری اسی دین پر موت ہونی چاہئے تمہاری موت آئے تو تم اسلام پر ہی ہو۔

وصیت فرمانے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اپنی اولاد کیلئے ایمان اور اسلام سے زیادہ کوئی شی محبوب نہ تھی ورنہ اسکی وصیت نہ ہوتی۔ ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے اولاد سے پیار، محبت، اخلاص کا کھلا درس مل رہا ہے اور قرآن مقدس کے اس ارشاد کی تفسیر بھی ہے ”وانذر عشیرتک الاقربین“ (اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈر سناؤ) اسی وصیت میں خاتمہ بالخیر کا اصول بھی بتا دیا گیا ہے کہ اگر خاتمہ ایمان و اسلام پر ہے تو یہ بالخیر ہے۔

ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو دین اسلام کی ثابت قدمی کا ہی درس دیا ہے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ملتِ ابراہیمی کا مرکزی ضابطہ اسلام ہی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی سرمایہ دار اپنی اولاد کو سرمایہ داری، تاجر اپنی اولاد کو تجارت، زمیندار اپنی اولاد کو زمینداری کی تاکید کرتا ہے۔ اہل اللہ کی بھی یہی خوشی ہوتی ہے کہ انکی اولاد دین کی لازوال نعمت کو سینے سے لگائے رکھیں اور لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی رہیں۔

قرآن مقدس نے اسلام کی اہمیت کو اس طرح ذکر فرمایا ہے ”ان الدین عند اللہ الاسلام“ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”امۃ مسلمۃ لک“ اور اسی آیہ کے آخری حصہ ”وانتم مسلمون“ کی نسبت سے ہی حضور ﷺ کی امت کا نام امتِ مسلمہ یا ملتِ اسلامیہ مشہور ہے۔ ان ارشادات سے بھی واضح ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین دینِ اسلام ہی تھا۔ جیسے حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہے۔ ”نحن معشر الانبیاء ابونا واحد وامہا تناشتی“ ہم انبیاء کا گروہ ہیں ہمارا باپ (اسلام) ایک ہے اور مائیں (شریعتیں) مختلف ہیں۔ اسلام کی روح کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ سے محبت کائنات سے زیادہ ہو، آپکی اطاعت بہر حال ہو، آپ کا ہر فیصلہ دل سے مانا جائے۔

﴿۱۲۳﴾ آیہ نمبر ۱۳۳ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم ہماری وصیت کا انکار کیسے کر سکو گے۔ یعقوب علیہ السلام نے اسی وصیت کو موت کے وقت برملا جمع عام میں ساری اولاد کے

سامنے ذکر کیا تھا کہ بتاؤ میری موت کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو سبھی نے جواب میں کہا تھا کہ ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا کے معبود، ابراہیم، واسماعیل واسحق کے الہ وحدہ لا شریک کی عبادت کریں گے۔ اے بنی اسرائیل جب یہ واضح اور کھلی وصیت تمہارے سامنے آگئی تو پھر یعقوب علیہ السلام پر یہ الزام لگانا کہ وہ تو اولاد کو یہودیت کی ترغیب دیتے تھے بڑا ظلم ہے۔

﴿۱۲۴﴾ آیہ نمبر ۱۳۴ میں ان سرکش یہود کو فرمایا گیا ہے جو یہ کہتے تھے ہمیں آخرت کا عذاب نہیں ہوگا ہمیں جہنم کی آگ نہیں جلانے گی۔ ہمارے آباؤ اجداد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ انکے اس نظریہ کی تردید فرمائی گئی ہے ان کے اعمال ان کے ساتھ ہیں تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ان کے کاموں کی تم سے جواب طلبی نہیں ہوگی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۴﴾
قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى
إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ
وَمَا أَوْتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أَوْتِيَ الَّذِينَ مِنْ
رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ
لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۲۵﴾

(یہودیوں نے) کہا یہودی ہو جاؤ (عیسائیوں نے کہا) عیسائی ہو جاؤ ہدایت پالو گے۔ (محبوب) آپ کہہ دیجئے (میرا دین) تو دین ابراہیم ہے جو سیدھا دین ہے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں نہیں تھا۔ تم کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے جو کچھ ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحق، یعقوب اور انکی اولاد پر نازل کیا گیا اور جو دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ (علیہم السلام) کو اور جو دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ ﴿۱۲۵﴾

ان آیات مبارکہ میں یہود و نصاریٰ کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اسلام کے ہزاروں واضح دلائل، حضور ﷺ کے حق و صداقت کے بے شمار نشانات دیکھ کر پھر بھی یہود مسلمانوں سے کہتے ہیں تم یہودی ہو جاؤ اور عیسائی مسلمانوں سے کہتے ہیں تم عیسائی ہو جاؤ ہدایت پالو گے۔ اے محبوب! (ﷺ) آپ کھلا اعلان کر دیں ہم تمہارے گمراہ کن ضابطوں کو کبھی نہیں مانیں گے ہم تو دین ابراہیمی، اسلام پر ہی رہیں گے۔ پھر اس دین ابراہیمی کی قدرے تفصیل بھی سنا دیں کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے ملا اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ایمان کی صورت بھی یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی نبوت پر بھی ہم فرق نہیں کرتے اور ہم اسی اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو درس ہے کہ تم یہود و نصاریٰ کی طرح متعصب، ضدی، ہٹ دھرم نہ بننا بلکہ تمام کتابوں اور تمام نبیوں پر ایمان لاؤ اور بحیثیت نبی ہونے کے کسی کے بارے میں فرق نہ کرو، سب کو مانو، بحیثیت نبوت کے تو سبھی برابر ہیں۔ مگر بحیثیت مرتبہ و کمال، عظمت و جلال کے فرق ہے۔ ”تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ“ رسولوں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے۔ اسی آیت کے آخر میں پھر مسلمان ہونے کے اعلان کا ذکر ہے۔ اسلام دین حنیف ہے۔ جو ٹیڑھے راستہ سے ہٹ کر سیدھی راہ پر ہو وہ حنیف ہے۔ بعض علماء نے تو یہ بھی کہا ہے کہ حنیف کا معنی اسلام ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیا جائے کہ اسلام صراط مستقیم ہے اور صراط مستقیم اسلام ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا محمد و علی آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

فَإِنْ أَنْتُمْ بِوَيْبِئَلٍ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَكَوْا
وَأَنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ
اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

سوا گروہ بھی ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے تو
ہدایت پالی اور اگر وہ پھر جائیں تو پھر وہی ضد میں
ہیں پس کافی ہے انہیں اللہ اور وہی سننے والا جاننے
والا ہے۔ ﴿۱۲۶﴾

تفسیر

﴿۱۲۶﴾ ایمانداروں کو فرمایا جا رہا ہے کہ یہود کے بعض نظریات جو دین سے تعلق رکھتے ہیں
انہیں دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ بھی ایمان دار ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ان کا بعض پیغمبروں کو ماننا یا کتاب کی کچھ
باتیں مان لینا اور کچھ کا انکار کر دینا یہ ایمان نہیں۔

ایمان تو یہ ہے کہ اسلام کو پورا پورا مانیں بعض باتوں کا اقرار اور بعض کا انکار ایمان نہیں اگر وہ
تمہاری طرح ایمان لائیں جیسے تم ایمان لائے کہ تمام انبیاء کو مانا اور تمام کتابوں کو تسلیم کیا تو تب وہ ہدایت
والے ہوں گے اگر کسی ایک عقیدہ میں بھی الگ ہو گئے تو وہ بھٹک گئے، حضور ﷺ کو تسلی دلائی جا رہی ہے کہ
محبوب مسلمانوں کے فقر و غربت پر پریشان نہ ہونا، آپ کو اور صحابہ کو ان کے مقابلہ میں اللہ کافی ہے اور پھر
یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ وہ رسوا و ذلیل ہو گئے۔ بنو قریظہ قتل ہوئے بنو نضیر کس پرسی میں در بدر پریشان
پھرتے رہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو
آپ قرآن پاک کی یہی آیہ تلاوت فرما رہے تھے۔ اس آیہ مبارکہ میں ایمان کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے
کہ ایمان وہی معتبر ہے جو حضور ﷺ اور صحابہ کے طرز پر ہوگا اور جو ایمان اس انداز سے ذرہ بھر بھی مختلف ہوگا
وہ معتبر نہ ہوگا۔ اس آیہ مبارکہ میں تمام گمراہ فرقوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ ایمان کے زبانی کلامی دعوے
مقبول نہیں۔ ہاں وہ دعوے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے ایمان کے مطابق ہوں تو صحیح ہیں ورنہ نہیں۔

اسی آیہ مبارکہ میں حضور ﷺ کی حفاظت و ذمہ داری کا بھی اعلان فرما دیا گیا ہے کہ محبوب ان کے مظالم سے پریشان نہ ہوں آپ کو ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کافی ہے جیسے دوسری آیہ شریفہ میں ذکر ہے۔
 ”وَاللّٰهُ يَعْصَمُكَ مِنَ النَّاسِ“ اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ اسی آیہ پاک میں جو حکم فرمایا گیا کہ صحابہ اور حضور کے ایمان کی طرح ایمان لاؤ۔ یعنی اپنے ظاہر و باطن دونوں میں صحابہ اور رسول اللہ کی اطاعت ضروری ہے اگر تم نے ظاہر تو صحابہ کی طرح بنا لیا اور باطن ٹھیک نہ کیا تو یہ نفاق تو ہو سکتا ہے ایمان نہیں۔ اس آیہ پر یہ اعتراض بے معنی ہوگا کہ حضور کو اللہ کی حفاظت حاصل تھی تو مشکلات و مصائب آپ پر کیوں آئیں اس آیہ کا معنی یہ ہے کہ دشمن آپ کو قتل نہ کر سکے گا۔ معمولی تکالیف کا پہنچنا آیت کے خلاف نہیں
 وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

(تم ان سے کہو) ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال اور ہم اسی کے ساتھ مخلص ہیں۔ ﴿۱۲۷﴾

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً
 وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ ۚ قُلْ أَتُحِبُّونَنَا فِي اللّٰهِ
 وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ
 أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ۚ

تفسیر

﴿۱۲۷﴾ اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے رنگ کا ذکر ہے اس رنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک معنی تو یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کا دین ہے۔ عیسائیوں میں ایک رسم تھی جسے ”بپتہ“ کہتے ہیں بچے کی پیدائش کے دن اس پر زرد رنگ کا چھڑکاؤ کرتے تھے یا زرد رنگ کا لباس پہنا دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ بچہ اب

پاک ہو گیا ہے اور عیسائیت میں داخل ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسے مصنوعی رنگ چھوڑو اللہ تعالیٰ کے حقیقی رنگ میں رنگے جاؤ اور وہ دین اسلام میں داخل ہوتا ہے۔

اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ فطرت پر رہو اور بچے کی فطرت ”اسلام“ ہی ہے۔ جیسے ارشاد نبوی ہے، ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی بنادیں یا عیسائی۔

اس خدائی رنگ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ بندوں کو چاہئے کہ صفات الہیہ سے متصف ہوں وہ رب ہے تو بندے کو بھی چاہئے کہ غریب پروری میں دلچسپی لے، بھوکوں کو کھلائے، وہ غفور ہے تو بندے کو بھی چاہئے کہ لوگوں کو معاف کرے، وہ ستار ہے، تو بندوں کو بھی چاہئے کہ اپنے بھائیوں کے جرائم پر پردہ ڈالیں اور بدنامی سے بچائیں۔ غرض وہ مخلوق باخلاق اللہ کے مظہر ثابت ہوں۔

سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کے معاملہ میں جھگڑا یہ تھا کہ یہود کہتے تھے ہم اللہ کے زیادہ قریب ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور ہم تم سے پہلے ہیں۔ محبوب! (ﷺ) ان کے اس موقف کے جواب میں آپ کہہ دیں ”آگے ہونے کا اعتبار نہیں بلکہ عمل اور اخلاص کا اعتبار ہے“۔ اخلاص یہ ہے کہ عبادت میں ریاکاری سے پاک رہو۔ اخلاص کے بارہ میں امام قشیری سے روایت ملتی ہے کہ حضور ﷺ نے جبریل سے پوچھا اخلاص کیا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی حضور ”میں نے یہی سوال رب سے کیا تو جواب ملا یہ ایک راز ہے جسے میں نے اپنے بندہ کے دل میں رکھا ہے۔“ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اخلاص یہ ہے کہ رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے بعض نے کہا کوئی کام لوگوں کی وجہ سے کرنا یا لوگوں کی وجہ سے نہ کرنا، ان دونوں صورتوں سے بچنا اخلاص ہے۔ بعض نے یہ کہا جس کام کو فرشتے لکھ نہ سکیں۔ شیطان برباد نہ کر سکے اور کسی انسان کو پتہ نہ چل سکے یہ اخلاص ہے۔ اخلاص کا بھی معنی ہے کہ بندہ اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپائے جیسے گناہوں کو چھپاتا ہے۔ ایک معنی یہ بھی ہے کہ اپنے عمل کو حقیر جانا اخلاص ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا
أَوْ نَصَارَى قُلْ إِنَّا أَعْلَمُ أَمْرَ اللَّهِ وَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٢٨﴾ تِلْكَ أَمَّةٌ قَدْ
خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ
وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی (محبوب) (فرمادیجئے تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ، اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس نے اس شہادت کو چھپایا جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ﴿۱۲۸﴾ وہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔ اس کیلئے وہی ہے جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہی ہے جو تم نے کمایا اور تم سے ان کے کاموں کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ ﴿۱۲۹﴾

تفسیر

﴿۱۲۸﴾ اس آیت مبارکہ میں یہود کے اس نظریہ کی پھر تردید فرمائی جا رہی ہے۔ جو کہتے تھے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی تھے یا نصرانی۔ انہیں کہہ دیجئے کہ (اس مسئلہ) کو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ اسی آیت مبارکہ میں اس شخص کو ظالم ترین انسان فرمایا جا رہا ہے جس نے خدا کی طرف سے شہادت ہونے کے باوجود اس شہادت کو چھپایا۔ وہ شہادت کیا تھی؟ جو انہوں نے چھپائی۔ وہ حضور ﷺ کی نبوت کی شہادت تھی۔ کتب سماویہ میں بہت سی بشارات پڑھ چکے تھے پھر بھی چھپاتے رہے یا دنیوی مفاد حاصل کرنے کیلئے غلط تاویلات کرتے رہے اور ان کتابوں کی تحریف کرتے رہے حالانکہ کئی راہبوں نے حضور ﷺ کی آمد کا ذکر کھلے لفظوں میں کیا ہے۔

جیسے ورقہ بن نوفل نے تصدیق کی، یہود حضور ﷺ کو اچھی طرح جانتے تھے اور پہچانتے تھے قرآن مقدس نے ان کے پہچاننے کا ذکر اس طرح فرمایا ”یعرفونه کما يعرفون ابنائهم“ وہ (حضور ﷺ کو)

اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس کھلی شہادت کو چھپاتے رہے۔ اس شہادت کے متعلق ایک قول یہ بھی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اچھی طرح علم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں ہونے والے انبیاء نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ ان کا دین دینِ حنیف تھا۔ وہ یہود اس علم کے ہوتے ہوئے بھی یہ بات چھپاتے تھے۔

﴿۱۲۹﴾ اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اُمت گزر گئی اس نے جو کام کئے ان کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے گا اور جو تم نے کئے تمہیں ان کا بدلہ ملے گا۔ اس کا معنی واضح ہے کہ اسکو اس کے عمل کی جزا ملے گی۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت کچھ لوگ بھٹک گئے اور کہا کہ کسی شخص کو کسی دوسرے کے عمل سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا یہ صحیح نہیں کہ نیک اولاد کے نیک کاموں سے فائدہ والدین کو بھی پہنچتا ہے۔ دوستوں کی دعا کا فائدہ بھی پہنچتا ہے کوئی شخص کسی کیلئے صدقہ جاریہ کرے تو اسے فائدہ پہنچتا ہے۔ ایصالِ ثواب کی محافل کا مرحومین کو فائدہ پہنچتا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ بعدد خلقہ